کنکری
انتظار حسین

افسانے

انتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ترتیب

انجنہاری کی گھریا

محلے میں کوئی نیا گھر بننا شروع ہوتا تو ایک نیا شغل مل جاتا۔ راجوں کی آنکھ بچی اور پیلی مٹی کے گارے میں سے حلواسی مٹی کی لپ بھری اور دوسری گلی میں پہنچ کر گولے بنانے شروع کر دیئے۔ دوپہر کی دھوپ میں گارے کا پانی کیسا جھمک جھمک کرتا تھا؟ اور سونا سی پگھلی ہوئی مٹی کے کسی تودے پر ایک لرزتی ہوئی سونے کی ڈلی سی رکھی ہوئی، ایک ڈھلی ہوئی شکل، جیسے کسی لڑکی کا بندا ہے کہ کان سے ابھی ابھی گرا ہے۔ راج کسلے سے پرانتوں میں گارا بھرتے اور بنتی ہوئی دیواروں کی طرف چل پڑتے۔ ادھر سے آنے والے راج خالی پرانتیں لاتے زمین پہ رکھ مٹی میں سنے کسلے سنبھالتے۔ انجنہاری کو آنے والے راجوں کی خبر ہوتی نہ جاتے راجوں کا پتہ چلتا، مزے سے بیٹھی ڈنک کو گردش دیتی رہتی اور آرام سے اُڑ جاتی۔ یہ آفت تو اپنے ساتھ تھی کہ راجوں کے اِدھر اُدھر ہونے کی تاک میں رہتے اور آنکھ بچا کر گارے کی لپ بھرتے۔ اس گارے کا گولا میں بعد میں بناؤں گا۔ لگے ہاتھوں یہ بات شروع ہی میں بتاتا چلوں کہ یہ افسانہ میں اپنے افسانے کو سمجھنے کی غرض سے لکھ رہا ہوں۔ انجنہاری کے واسطے سے اپنے افسانے کی بات کرنا اکثر لوگوں کے لئے میری کم علمی اور گنوار پن کی دلیل بن سکتا ہے۔ بعض لوگ شاید میری انکساری سمجھ کر چپ ہو رہیں۔ مگر چند ایک لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اسے ایک دعویٰ سمجھیں گے اور اس خودستائی پہ نہ جانے کیا کچھ کہیں گے۔ اس حوالے سے بات کرنے میں مجھے خود ایک دعویٰ کا احساس ہوتا ہے اور مجھے اس میں تامل بھی ہوا تھا۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ میں کسی ایسی ہستی کے حوالے سے بات کرنی چاہتا تھا جو افسانہ نگاری کے معاملے میں میرے لئے سند ہو۔ سند کو میں نے سرٹیفکیٹ کے معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ہمارے یہاں بالخصوص شعر اور بالعموم نثر کی کتابوں سے دن رات ان گنت لکھنے

والوں کو عطا ہوتے ہیں۔اس پیہم جاری عمل میں اگر میں اپنی کسی معذوری کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکا ہوں تو اس میں کھنڈت بھی نہیں ڈالوں گا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ زندہ تعلق میرا کتابوں سے نہیں مخلوقات سے رہا ہے اور سند اپنے لئے زندہ نجی تعلق کا معاملہ ہے، پنچایت کے چنے ہوئے مُڈھوں سے اپنے حق میں فیصلے کرانے اور دوسروں کا حقہ پانی بند کرانے کا سلسلہ نہیں ہے۔

زندہ تعلق اپنا کتابوں سے نہیں رہا (سوائے ان گنتی کی کتابوں کے جو اپنے لئے کتابیں نہیں رہیں، مخلوقات بن گئیں)، مخلوقات سے بے شک رہا۔لیکن یہاں میں نے مخلوقات میں بھی امتیاز برتا ہے۔آخر میں شہد کی مکھی کا حوالہ بھی تو دے سکتا ہوں جس پر وحی نازل ہونے کی سند موجود ہے، یا بئے کو بیچ میں لے آتا جس کے احساس تعمیر کے بڑے بڑے قصیدے پڑھے گئے ہیں۔مگر اول تو میں ان دونوں میں سے کسی کو افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ ان سے میرا ایسا ذاتی اور جذباتی تعلق نہیں رہا۔شہد کی مکھی کے سلسلے میں تو یہ وقت ہے کہ پہلے ہی شہد کا لفظ آ جاتا ہے اور خواہ مخواہ ایک قسم کی افادیت کا دم چھلا اس کے ساتھ لگ جاتا ہے۔یوں شہد کی مکھی کا چھتہ گنا فیکٹری قسم کی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔اس افادیت سے میں چشم پوشی بھی کر لوں تو بھی بات نہیں بنتی۔شہد کی مکھی کا چھتہ اس صورت میں بھی پنچایتی آرٹ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔گویا کوئی بڑا قلعہ تعمیر ہو رہا ہے اور چھوٹے بڑے ان گنت معمار اس میں جتے ہوئے ہیں۔رہا بئے کا معاملہ تو بے شک بچپن میں جنگلوں میں آوارہ پھرتے ہوئے کبھی کبھی کسی درخت کی طرف نگاہ اُٹھی ہے اور اسے معلق ننھا منا محل کہئے یا آویزاں باغ سمجھئے اس پہ نگاہیں جمی کی جمی رہ گئی ہیں۔یہ تعلق اوّل تو ایسا گہرا نہیں۔پھر بئے کو میں ماہر تعمیرات تسلیم کر لوں گا۔افسانہ نگار نہیں مانوں گا۔افسانہ نگار کا میں جب بھی تصور کرتا ہوں تو میرے ذہن میں انجھاری ہی آتی ہے۔گندھی ہوئی گیلی مٹی سے افسانے کی جزئیات کی طرح ذرّہ ذرّہ کر کے مٹی فراہم کرنا، دیوار کے کسی گوشے میں اس نفاست، احتیاط اور صبر سے اسے پھیلانا گویا ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کو بنا سنوار کر نثر لکھی جا رہی ہے۔کسی ہرے بھرے درخت کے سائے میں تنتے ہوئے کسی مکڑی کے تار کو توڑ کر ایک سبزہ زندہ شے کو دبوچ کر لے اڑنا۔اس سبز زندہ شے کو گھریا میں رکھ کر اس کا منہ بند کرنا اور پھر یہ انتظار کھینچنا کہ کب اس منہ بند گھریا

سے ایک زندہ کردار، ایک نئی زندگی اُبھرتی ہے۔افسانہ نگاری اگر یہ نہیں تو پھر کیا ہے۔اس کی سند بیشک کہیں نہ ملے مگر اپنا ایمان ہے کہ انجھاری پر وحی نازل ہوتی ہے۔اب میں سوچتا ہوں تو یوں نظر آتا ہے کہ افسانہ نگاری کے اس پیغمبر کی میں اب تک تقلید کرتا رہا تھا مگر بڑے پھوہڑ پن سے۔

افسانہ نگاری کے اس پیغمبر سے میرا خاصا قریبی تعلق رہا ہے۔مراتب کا فرق ہوا کرے مگر ایک ایسا مقام ضرور تھا جہاں ہم ملتے بھی تھے اور جہاں سے جدا بھی ہوتے تھے۔یہ تھا پیلی مٹی کا گارا جہاں سے انجھاری اطمینان سے مٹی چن کر لے جاتی تھی اور راج اسے کبھی نہ ٹوکتے تھے۔لیکن میں گارے کی طرف بڑھا اور کوئی بھی جھڑک دیتا۔نہ جانے یہ رقابت کا احساس تھا یا انجھاری اور اس کی گھریا ہی پیاری سی چیزیں لگتی تھیں کہ بارہا انجھاری کو پکڑنے کی کوشش کی اور اس کی گھریا تک پہنچنے کے منصوبے باندھے مگر کامیابی کبھی حاصل نہ ہوئی۔

ذکر تھا انجھاری کا مگر میں نے انجانے میں اپنی ایک اور دکھتی رگ چھیڑ دی ہے پیلی مٹی کے گارے کا ذکر چھڑا ہے تو اب مٹی کے عجب عجب کھیل اور رنگ رنگ کے گھروندے یاد آ رہے ہیں۔اپنے گھر کی وہ کچی چھت یاد آ رہی ہے جہاں بارش پڑتے ہی ہم چاقو کا ٹوٹا ہوا پھل لے کر پہنچ جایا کرتے تھے اور گیلی زمین میں سے شکر پارے تراشتے تھے۔وہ چکنی سنی ہوئی مٹی یاد آ رہی ہے جسے ہم خوب گوندھ کر غلے تیار کرتے، پھر انہیں چولہے کی گرم راکھ میں پکا کر کبوتروں اور چڑیوں کے شکار کے لئے نکلتے۔دیوالی کے دیوے، بستی سے باہر ٹوٹے ہوئے بے آباد مندروں کی بے یار و مددگار مورتیاں، رمضان کی شاموں کو چھت کی منڈیر پہ رکھی ہوئی کچی صراحی، بائیس رجب کی صبح کے جھٹپٹے میں سرخ کورے مہکتے کونڈوں کی قطاریں، ساتویں محرم کی شب میں کیوڑے کے شربت سے چھلکتے ہوئے سوندھی سوندھی خوشبو والے کوزے، خاک شفا کی وہ تسبیح جس کے دانے بقول میری والدہ کے ہر سال عاشورہ کی صبح کو سرخ پڑ جاتے تھے۔میں کس کس مٹی کو یاد کروں۔مٹی میرے لئے ایک چکر ہے جس سے میں کسی بھی رستے سے نہیں نکلتا۔جس مذہب سے میرا تعلق ہے اس کے متعلق میں نے بہت سن رکھا ہے کہ وہ مٹی سے بلند ایک طاقت ہے۔مگر میں اسے کیا کروں کہ میں اپنے مذہبی احساس کا تجزیہ کرتا ہوں (اگر وہ مجھ میں ہے) تو اس کی تہہ میں بھی مٹی جمی ہوئی ہے۔ مجھے

اپنے بچپن کی نمازیں اس وقت آج کی سی بات لگ رہی ہیں۔ ہمارے محلے کی مسجد میں لکڑی کی سجدہ گاہیں ڈھیروں رکھی تھیں مگر مٹی کی سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے کا موقعہ ملتا تو مجھے سجدے میں وہ لذت حاصل ہوتی کہ جی چاہتا تھا کہ سجدہ اتنا طویل ہو، اتنا طویل ہو کہ کبھی ختم نہ ہو۔ اپنے والد سے میں نے رسالت مآبؐ کے بہت معجزے سنے ہیں لیکن جس معجزے کا مجھ پہ بہت رعب ہے وہ یہ ہے کہ چند اعرابی آکر للکارتے ہیں کہ

''اپنے آپ کو رسول کہتے ہو؟ اگر واقعی رسول ہو تو کوئی شہادت پیش کرو، کوئی معجزہ دکھاؤ''

رسالت مآب زمین میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور چند کنکریاں مٹھی مین لیتے ہین اور وہ کنکریاں کلمہ شہادت پڑھتی ہیں اور مجھے یہ واقعہ بھی بھلائے نہیں بھولتا کہ رسولؐ نے علی کو زمین پہ سوتے دیکھ کر ابوتراب کا خطاب عطا کیا تھا۔ آخر یہ مٹی کیا ہے؟ وہ چکر کیوں بن جاتی ہے۔ اس میں کوئی ایسی طاقت بھی ہے جو تکلم کرتی ہے اور رسالت کی شہادت دیتی ہے؟ مٹی اپنے پوشیدہ خزانے تو بے شک قیامت ہی کے دن اُگلے گی لیکن کبھی کبھی یہ کیا ہوتا ہے کہ اچانک قدموں کے نیچے کوئی خزانہ چھنکتا ہے، پکارتا ہے، اپنے آپ کو حوالے کرنا کا اعلان کرتا ہے۔ بھینٹ مانگتا ہے؟ یہ چھناکا، یہ پکار ایک چکر بن جاتی ہے۔ بھینٹ دے کر اس خزانے پر قبضہ کیجئے۔ ورنہ خود بھینٹ چڑھ جایئے۔ جن لوگوں کو یہ پکار سنائی نہیں دیتی وہ محفوظ ہیں۔ مگر جس کسی نے یہ پکار سن پائی ہے اس کے لئے بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں ہے۔ اسے خزانہ ملے گا یا جان جائے گی یا دماغ چل جائے گا۔

مگر سوال پھر بھی جہاں کا تہاں رہا۔ آخر یہ مٹی ہے کیا؟ اس کی گواہی رسالت تک کے معاملے میں معتبر مانی جاتی ہے۔ بے سہارا بچے اس کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں اور صاحب جلال پیغمبر بن کر نکلتے ہیں۔ مٹی میں آخر کیا جادو ہے؟ اس کی تہہ میں کون سے خزانے پوشیدہ ہیں؟ کیا وہ اشرفیوں کی دیگیں ہیں جو زمین کے نیچے ہی نیچے سرک کر کہیں جا پہنچتی ہیں؟ کیا وہ راجہ باسک کا محل ہے جس کا ناگ پھن جیسا سنہری کلس زمین کی اندھیریوں میں جگر جگر چمکتا ہے؟ کیا وہ کوئی زمین دوز قلعہ ہے جہاں ایک طلسمی چراغ جلتا ہے جس کا جن راتوں رات محل تعمیر کرسکتا ہے؟ اور یہ مٹی کا پورا گولا، یہ کرہ ارض جس کا تین چوتھائی پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔

اس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کوئی جادو کا گولا نہیں؟ سائنس کی روایت کے مطابق فضائے بسیط میں کھربوں سیارے، کھربوں صدیوں سے یوں آوارہ گھومتے پھر رہے ہیں۔ جیسے گرمیوں کی دوپہریوں میں بڑیاں اڑتی رہتی ہیں، بے مقصد بے منزل، ایک جلتے بلتے سیارے سے ایک کنکی جھڑی، گرمی میں گھومتی رہی، ٹھنڈی پڑتی رہی اور آخر اس کی تہہ سے ایک نئی زندگی ابھری۔ اب ہم اسے کرہ ارض کہتے ہیں۔ مگر یہ تو وہی انجھاری کی کہانی ہوئی۔ کسی انجھاری نے سورج کے پیلے گارے میں سے چند ریزے چنے اور کسی گائے کے سینگ پہ گھریا بنا دی وہ گائے واقعی اللہ میاں کی گائے ہے کہ ان گنت صدیوں سے چپ چاپ کھڑی ہے، مگر کون جانے کہ کب کوئی فطرت کا معصوم عنصر گائے کو اونگھتا پا کر اپنی معصومانہ شرارت میں یہ گھریا توڑ دے اور انجھاری کی ساری محنت پہ پانی پھر جائے۔

اگر زمین انجھاری کی گھریا ہے تو ضرور دوپہر کے وقت عالم وجود میں آئی ہوگی۔ میں نے چلتے چلتے اپنے بارے میں ایک فقرہ لکھا تھا کہ میں تو ٹیکا ٹیک دوپہری میں افسانے لکھتا ہوں۔ یاروں نے اسے مذاق سمجھا۔ اب میں پھر اسی بات کو پوری سنجیدگی کے ساتھ دہراتا ہوں۔ مگر مجھے ایک ڈر ہے کہ کوئی بھلا آدمی میرے روئے میں ایک تضاد تلاش نہ کر لے اور اعتراض کرے کہ پرانی قصہ کہانیوں اور داستانوں سے رشتہ جوڑنے پہ بھی مصر ہو اور افسانہ لکھتے ہو دوپہر میں۔ یہ اعتراض بظاہر درست ہے۔ پرانی قصہ کہانیاں اور داستانیں رات کی چیز ہیں۔ میں نے اپنی نانی اماں سے جتنی کہانیاں سنیں سب رات میں سنیں۔ جب کوئی کہانی بہت لمبی ہوتی اور رات کو ختم نہ ہوسکتی تو میں دن میں تقاضا کرتا کہ

''نانی اماں وہ رات والی کہانی ختم کر دیجئے۔''

نانی اماں دھواں دیتی لکڑیوں کو پھونکتے ہوئے جواب دیتیں۔

''نا بیٹا دن کو کہانی نہیں کہتے۔ کوئی مسافر رستے میں ہوا تو غریب رستہ بھول جائے گا۔''

یہ جواب میرے دل پر آج تک نقش ہے۔ نانی اماں اللہ کو پیاری ہوئیں تو ہمارے گھر سے کہانیوں کا دفتر مٹ گیا۔ میں سمجھا کہ دن نکل آیا۔ نانی اماں گئیں۔ نانی اماں کے ساتھ رات گئی، رات کے ساتھ چکوا چکوی گئے جو زمین کا بھید بتاتے تھے، اس کے خزانوں کا پتہ

دیتے تھے اور ریل گاڑی چل نکلی جو مسافروں کو ہر حال میں منزل پہ پہنچاتی ہے۔ میری نانی اماں کے انتقال کے ساتھ افسانہ نگاری کا ایک پورا دور ختم ہو گیا...... میں نے اس دور کا بہت افسوس کیا ہے۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ نانی جو شوق دم کے ساتھ لگا گئی ہیں۔ اس سے اب چھٹکارا ممکن نہیں۔ وہ تو ایک دیوار ہے، ایک چکر۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے خاصی تعداد میں کہانیاں لکھی ہیں اور سب دن میں لکھی ہیں مگر کہانی تو وہ ہے کہ دن میں کہی جائے تو مسافر کو رستہ بھلا دے۔ میں اپنی پچھلی ساری کہانیوں پہ نظر ڈالتا ہوں تو بڑے دکھ کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ اپنے پاس کوئی ایسی کہانی نہیں کہ مسافر کو رستہ بھلانے کا جادو رکھتی ہو۔ نانی جان چل بسیں، یہ گُر بتا کے نہ گئیں کہ مسافروں کو رستہ بھلانے والی کہانی کیسے بنتے ہیں۔ خیر انجھاری تو زندہ ہے۔ وہ اب بھی اسی انداز سے گھریا تعمیر کرتی ہے۔ ٹیکا ٹیک دوپہری میں جب سورج ٹھیک سر پہ ہوتا ہے اور راج مزدور اپنے کسلے اور پرانتیں چھوڑ کر کسی دیوار سے، کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر جھپکی لیتے ہیں اور دور پھولوں کی کسی جھاڑی کے اندر بھنبھناتے ہوئے بھنورے کی آواز فضا میں غنودگی کے تار پھیلاتی ہے اور چیلیں بہت بلندی پر اُڑتے اُڑتے بالکل ساکت ہو جاتی ہیں، اس وقت انجھاری کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ یکسوئی سے اپنی تعمیر کا کام کرتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دن، رات جتنا پراسرار بن جاتا ہے۔ دن میں تخلیق کا لمحہ اگر کوئی ہوتا ہے تو وہ یہ ہوتا ہے۔ سنہری مٹی کا گارا اس وقت سورج کی زد میں ہوتا ہے اور راج درخت کے نیچے ستاتے ہیں۔ اس وقت انجھاری اپنی گھریا کی تعمیر پوری کرتی ہے، اس کا منہ بند کرتی ہے۔ انجھاری کی اس ازخود رفتگی اور ستاتے ہوئے راجوں کی جھپکی کے خمیر سے میں اپنے افسانے کی تعمیر اُٹھانا چاہتا ہوں۔ شاید اس خمیر کے افسانے میں وہ رات والا جادو ہو کہ رستہ چلتے ہوئے مسافر منزل سے بھٹک جائیں۔ راجوں کے خون پسینہ ایک کرنے کی پورے دن کی داستان میں دوسروں کے لئے چھوڑتا ہوں۔ میں تو اس ایک جھپکی کو اپنے لئے محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ مسافروں کو رستہ دکھانے والے بہت سے ہیں۔ وہ شوق سے قیادت کریں، رہنما بنیں۔ مگر ایک شخص کو یہ اجازت بھی مل جانی چاہئے کہ وہ راہ چلتے مسافروں کو بھٹکا سکے۔

میلے سے واپسی میں راہ سے بھٹک جانے والا بچہ، وہ اکیلا کبوتر جو اپنی چھتری سے

بہت دور کسی اونچے کوٹھے پہ بیٹھا رہ جائے اور اسے رات آ لے، اندھیرے ہوتے ہوئے آسمان پر وہ ڈگمگاتی ہوئی اکیلی پتنگ جسے کھینچتے ہوئے ہر بار پتنگ باز یہ محسوس کرے کہ اب کسی درخت میں الجھی، مرغی کا وہ بچہ جو شام پڑے آنگن میں اکیلا رہ جائے اور سارے آنگن کا بدحواسی میں چکر کاٹے مگر ڈربے میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ تصویریں مجھے رہ رہ کر ستاتی ہیں۔ شاید اپنے کردار بھی اسی قسم کے ہیں، نہیں بلکہ یہ مخلوقات ہی اپنے کردار ہیں، اجتماع سے بچھڑ جانے کے احساس کا رشتہ بھی بے شک اجتماعی شعور سے ملتا ہے۔ لیکن اجتماعی شعور اپنے یہاں ان معنوں میں تو ہرگز نہیں جن معنوں میں پرانی نسل کے بعض افراد کے ساتھ بریکٹ کر کے ٹٹولا گیا ہے۔ مجھ یہاں اپنے بچپن کا ایک واقعہ پھر یاد آ رہا ہے۔ یہ عجب مصیبت ہے کہ میں اپنے متعلق کوئی بات بچپن کے حوالے کے بغیر نہیں کر سکتا۔ خیر، تو وہ واقعہ سنئے۔ کچھ اسی رنگ کی دوپہری تھی جس کا میں ابھی راگ گا چکا ہوں۔ گرمیوں کے دن، بستی سے دور اِملی کے چند درخت تھے۔ جن کے نیچے ہم بہت سے لڑکے اِملی کی کٹاریں بین رہے تھے۔ رفتہ رفتہ کٹاروں سے توجہ ہٹی اور جن بھوتوں کے قصے چل نکلے۔ سامنے خاصے فاصلے پر کربلا کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کے پرلی طرف ہم سب کا خیال تھا کہ ایک چڑیل رہتی ہے اور کھڑی دوپہری میں نکلتی ہے۔ ایک دوسرے کو ہم سب نے اتنا جوش دلایا کہ ہم آخر اس ان دیکھی طاقت کو دیکھنے کے عزم سے چل پڑے۔ یہ املی کے درخت ایک شفاخانے کی حدوں میں تھے۔ ان کے ختم پر خاردار تار کا ایک سلسلہ تھا۔ ہم سب نے تار کو پھلانگا۔ لیکن ابھی دو ہی قدم چلے تھے کہ ایک لڑکے نے گھبرا کر اشارہ کیا کہ ''وہ رہی چڑیل'' اور سب کے سب خاردار تار پھلانگ کر اُلٹے بھاگ لئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ پاؤں سو سو من کے، تار ہاتھ سے چھوا نہ جائے۔ لڑکے دم کے دم میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا، اور میں تن تنہا۔ یہ لمحہ مجھے آج تک نہیں بھولا۔ لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں اپنا وقت بہت صرف ہوا۔ مگر یہ ایک لمحہ سارے تجربات پر بھاری ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد جب سماج کا ڈول ڈال رہے تھے اس وقت بھی جب کوئی فرد قبائلی الاؤ کی آگ سے بچھڑتا ہوگا تو اس پہ کچھ بڑے پیمانے پر یہی عالم گزرتا ہوگا اور فطرت کا ہر معمولی ذرہ، درخت کی ہر شاخ اسے اپنے اوپر تلوار کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ یہی خوف سماج اور اجتماع کے قیام کا سبب بنا ہے۔ اجتماعی

شعور بیشک بڑی شے سہی مگر انسان کا بنیادی احساس، اپنی تنہائی کا احساس تو اس کی تہہ میں جوں کا توں موجود ہے۔ کسی بھی لمحہ وہ اجتماعی شعور کے غلاف کو چیر کر سطح پر آ سکتا ہے۔

یہ تنہائی کا اجتماعی احساس اس نسل کیلئے قطعی طور پر اجنبی چیز ہے۔ جس نے سیاسی جلوسوں اور نعروں کی فضا میں پرورش پائی ہے۔ ہماری قوم پر اس ملک کے قائم ہونے کے ساتھ یہ احساس بیتا ہے اور ابھی تک وہ اس سے نجات نہیں پا سکی ہے۔

میں اس بات کو دانستہ ادھورا چھوڑتا ہوں۔ میں نے بات چٹکی بھر مٹی سے شروع کی تھی اور نوبت یہ آئی ہے کہ علمیت بگھارنے پہ آمادہ ہوں۔ اگر میں نے یہ انداز کچھ دیر اور برقرار رکھا تو مجھ پہ کسی کتاب کا حوالہ دینا بھی لازم آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے مقام پر پھر آ جاؤں۔ مٹی مجھے پھر اپنی طرف کھینچ رہی ہے، میرے گرد حلقہ ڈال رہی ہے۔ اس حلقے میں مجھے اماں نظر آتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ مٹی سے میرے قدم اُکھڑے اور کوئی دیو مجھے بھینچ کر میری پسلیاں توڑ دے گا۔ مٹی میرے لئے محض ایک چکر ہی نہیں ہے، حصار بھی ہے۔ اس حصار میں رہ کر میں جنات کے اندیشے کے بغیر جلالی وظیفہ پڑھ سکتا ہوں۔ ہاں مگر میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ حصار میری مٹھی میں بند ہوسکتا ہے۔ جس چکر میں گھرا ہوا ہوں کیا اسے اپنے چکر میں گھیر سکتا ہوں۔ افسانہ مٹی سے پیدا ہوتا ہے، اُگتا ہے مگر اسے ایک منزل پر تناور درخت بن جانا چاہئے کہ اس کی جڑیں آس پاس کی ساری زمین کی ساری تری کھینچ کر صرف اپنے کام میں لائیں۔ افسانہ نگار میں اتنی بوترابیت تو ضرور ہونی چاہئے کہ پتھر پہ اپنا علم گاڑ سکے۔ میں نے مٹی کے اتنے رنگ گِنا ڈالے مگر میں سوچ رہا ہوں کہ اس رنگ رنگ کی مٹی کو ایسے سانچے میں کس طرح ڈھالوں کہ اس پہ میرا رنگ غالب رہے۔ جو تسبیح میں پروتا ہوں اس میں بنانے والے کا خون اس شان سے کب داخل ہوگا کہ خونِ حُسین کی طرح تہہ میں پنہاں بھی رہے اور عیاں ہو کر اپنا اعلان بھی کر سکے۔ افسانہ بے شک انجہاری کی گھریا ہے مگر جس انجہاری کی گھریا کے اندر سے ایک نئی اور زیادہ حسین انجہاری نہیں نکلتی وہ یا تو انجہاری کی گھریا نہیں ہے یا پھر اس انجہاری پر وحی نازل نہیں ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

مجمع

پنن کی امی سے خدا بچائے، ایسے آڑے ہاتھوں لیتی ہیں کہ پنن بیچارہ تو کس شمار وقطار میں ہے، پنن کے ابا تک کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے چھوٹتے ہی طعنہ دیا۔ ''روتا جاے مرے کی خبر لائے۔'' پنن مرے کی خبر لایا تھا یا زندہ کی، یہ تو اس کی امی جانیں لیکن اتنا طے ہے کہ گھر سے روتا ٹھنکتا نہیں گیا تھا۔ دراصل پنن کو جتنا غیر ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اتنا غیر ذمہ دار وہ ہے نہیں۔ اب پنن کی امی سے کہے کون، وہ خود اس وقت جاگتی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ سل بٹا دھو کر جب انہوں نے ہنڈیوں کلھیوں کو ٹٹولا تب انہیں یاد آیا کہ دراصل ہلدی تو کل ہی ختم ہو چکی تھی۔ صبح بھی بس لشٹم پشٹم کام چلا تھا۔ انہوں نے جھٹ پٹ بٹوے سے پیسہ نکالا اور پنن کو ڈانٹ بتائی۔

''دیکھ رے، جلدی ہلدی لے کے آئیو۔ مسالہ پیسنے کو بیٹھی ہوں۔ اگر رستے میں کہیں رکا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔''

وقت کے تقاضے کا احساس خود پنن کو بھی تھا، امی کی ڈانٹ نے اس میں دوگنا چوگنا اضافہ کر دیا۔ وہ گھر سے خاصی گرمجوشی سے روانہ ہوا تھا۔ رستے میں سخت مقامات بھی آئے لیکن وہ سلامتی کے ساتھ گزر گیا۔ چوک کی رونق نے تو بہت ہی لبھایا۔ ٹول کے کھٹکے کے ساتھ جب ببول کی نئی بنی ہوئی اجلی گلی فضا کی بلندیوں میں تیرتی نظر آئی تو اس کا دل لوٹن کبوتر بن گیا۔ لیکن پھر اس نے ہمت کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور چال کو تیز کیا۔ چوک سے نکل کر وہ بہت تیزی سے بزریا کی طرف چلا تھا۔ لیکن آخر اسے پیسے کی ہلدی ہی خریدنی تھی، گل بکاؤلی لینے تو وہ چلا نہیں تھا اور ایک سانس میں تو تاج الملوک نے بھی ساری منزلیں طے نہیں کی تھیں۔ آواز کے جادو سے کون واقف نہیں۔ سندباد جہازی کے ساتھی اس میں پھسل کر

دھڑام دھڑام سمندر میں کود پڑے تھے۔ اگر پتن بھی چند منٹ کے لئے نتھیا سنار کی دکان کے سامنے ٹھہر گیا تو یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہ ہوئی۔ نتھیا لہک لہک کے پڑھ رہا تھا۔

بندر دیکھے جب بے گنتی نر ملکھے نیکھا پکار
یہ کیا کہ اس جنگل میں بندر دیکھے بے شمار

اوں اوں کر کے بندر بولے کچھ بولی میں رہے بتائے
ملکھے تاہر دونوں سنتے مطلب نہیں سمجھ میں آئے

بولا تاہر پھر ملکھے سے جودہا سر سے کے ملکھان
یہ بندر جادو کے دیکھیں، پہلے معلوم ہوں انسان

مجھ کو اگوا یہ سوجھے ہے یہاں جو بندر بے شمار
دیکھے پلٹن یہ وہاندو کی ان پر پڑی جادو کی مار

کمبخت نتھیا آلھا پڑھتا ہی اس خوش گلوئی سے ہے کہ بزریا کے اچھے اچھے دوکانداروں کا بنیا پن رفو چکر ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے تھڑوں کو چھوڑ کر نتھیا کی دوکان کے سامنے پڑے ہوئے جھلنگے پر مجمع لگا لیتے ہیں۔ تعریف کی بات تو یہ ہے کہ پتن نے اس مستی میں بھی ہشیاری دکھائی۔ ادھر نتھیا چلم میں تمباکو رکھنے کے لئے اندر گیا۔ ادھر پتن نے پھریری لی اور آگے چل پڑا۔ امی کی ڈانٹ پھٹکار کے خیال نے اس کی چال میں غیر معمولی تیزی پیدا کر دی تھی۔ البتہ صادق پنواڑی کی دوکان کے سامنے پہنچ کر اس کی چال پھر سست پڑ گئی۔ پتن اگر چوسر کے کھیل کو سمجھتا ہوتا تو ممکن ہے وہ یہاں بھی چند منٹ قیام کر لیتا۔ لیکن یہ تو محض قیاس کی بات ہے اور محض قیاس کی بنیاد پر ہمیں کسی کی نیت پر حملہ کرنے کا کیا حق ہے واقعہ تو بس اتنا ہے کہ پتن صادق کی دوکان کے سامنے چند لمحوں کے لئے ٹھٹھکا۔ لیکن پھر اس نے فوراً ہی اپنا آپ سنبھالا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ گرم رفتاری کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔ دراصل ہم صادق کی دوکان کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں اور صحت بیان کے تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں پتن نے گھر سے چل کر نتھیا کی دوکان پر دم لیا اور نتھیا کی دوکان سے

روانہ ہو کر پیاؤ پر منزل کی۔

پیاؤ کے سامنے ایک سمت میں چادر بچھی ہوئی تھی اور اس پہ چند نیلی پیلی شیشیاں، چند شیشے کے مرتبان، چند زنگ آلود ڈبے چنے رکھے تھے۔ لیکن جس چیز نے پتن کو سب سے پہلے متوجہ کیا وہ ایک انسانی ڈھانچے کی بھدی میلی سی تصویر تھی۔ اس کی ہڈیوں کی مالا کا اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد وہ شیشیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک میلے سے مرتبان میں پیلی مٹی پڑی تھی اور اس میں دو کالے بچھو رینگ رہے تھے۔ پتن کی طبیعت میں گجگجاہٹ سی پیدا ہوئی۔ اس نے اس طرف سے نگاہیں ہٹا لیں اور پھر بڑے انہماک سے اس مرتبان کو دیکھنے لگا جس میں ایک زرد رنگ کا سانپ ادھ مری حالت میں پڑا تھا۔ دراصل ابھی مجمع لگنے کی تیاریاں تھیں۔ ایک شخص بڑی سنجیدگی سے شیشوں اور ڈبیوں کو ٹٹولنے میں مصروف تھا۔ پتن نے سوچا کہ ابھی مجمع لگنے میں تو دیر ہے، لاؤ جھٹ پٹ ہلدی خرید کے گھر دے آئیں۔

پتن نے پیاؤ سے جو دوڑ لگائی تو پنساری کی دوکان پر ہی پہنچ کر دم لیا۔ درحقیقت وہ واپسی میں بھی اسی جوش و خروش کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دقت یہ پیش آئی کہ ہلدی کے ساتھ ساتھ وہ لبھاؤ میں گولے کا ایک ٹکڑا بھی لے آیا تھا۔ لبھاؤ بھاگ دوڑ میں کھانے کی چیز تو ہے نہیں۔ اس کے کھانے کا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ ٹہلتے جاؤ اور ٹونگتے جاؤ۔ خیر ٹہلنے کی حد تک نہ سہی لیکن کسی نہ کسی حد تک اس کی رفتار ضرور دھیمی پڑ گئی۔

جب وہ پیاؤ کے قریب پہنچا تو وہاں ایک مجمع جمع ہو چکا تھا۔ وہ بہت مات ہوا۔ گھر جانے کا سوال تو خیر ختم ہو ہی چکا تھا۔ لیکن یہ سوال بھی کچھ کم ٹیڑھا نہیں تھا کہ آدمیوں کے اس ٹھٹ کو چیر کر اگلی صف میں کیونکر پہنچا جائے۔ مگر ارادے اور یقین کی بھی بڑی بات ہے پہلے تو اس نے چاروں طرف گھوم کر مجمع کی چار دیواری کا جائزہ لیا۔ ایک طرف دَل نسبتاً چھدرا ہو گیا تھا۔ پتن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک مرتبہ سر جھکا کے گھس ہی تو پڑا۔ کئی ایک اشخاص نے اسے بہت گھور کے دیکھا، کچھ لوگ غرائے، ایک دو آدمیوں نے اسے دھکیل دینے کی بھی کوشش کی۔ لیکن اگر مجمع میں سے ایک دو آدمی بھی نرم پڑ جائیں تو پھر اس میں سے رستہ بنا لینا ایسا مشکل نہیں رہتا، چنانچہ پتن بھی سمٹتا سمٹاتا لوگوں کی ٹانگوں میں سے نکل نکلا کر آگے کی صف

میں جا ہی پہنچا۔

''تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آدھی رات تک خوب چہلیں ہوئیں۔خوب گلچھرے اڑے''

عطائی نے ایک لمحہ توقف کیا۔ دراصل اس وقت وہ تریا چلتر کا قصہ سنا رہا تھا۔ پنن کو اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس نے جھٹ پٹ اوسان سنبھالے اور گوش و ہوش کو ان کے فرض سے خبردار کیا۔ عطائی نے ایک لمحہ کے توقف سے اپنی تقریر پھر شروع کر دی تھی۔

''آدھی رات کے بعد (ایک دم اونچی آواز کر دیتا ہے) ہاں تو آدھی رات کے بعد جب ٹن ٹن گھڑی نے دو بجائے (آواز پھر معمول پر آجاتی ہے) تو (با آواز بلند) تو ایکا ایکی اس کے خصم نے دروازہ جھڑ جھڑایا۔ اب تو وہ بڑی گھبرائی اور اس کے دگڑ کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سٹی گم ہوگئی۔ دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ عورت کو بڑا تاؤ آیا (آواز بلند ہو جاتی ہے) کہنے لگی کہ ابے بذات نامرد جب تجھ میں ہمت نہ تھی تو اس انجھیڑے میں کیوں پھنسا۔ عشق کو بھی تو نے خالہ جی کا گھر سمجھا ہے۔ اب تو میرا کہا مان اور دیکھ کہ میں اس مردوئے کو کیسا چٹکیوں میں اڑاتی ہوں۔''

عطائی نے ایک ذرا پھر توقف کیا اور پورے مجمع کو نظر بھر کے دیکھا۔ اچانک وہ پھر گرجا۔ ''اس ہفت رنگن نے کیا کیا کہ اپنے یار کا ہاتھ پکڑ (آواز پھر معمول پر آجاتی ہے) فراٹے سے آنگن میں پہنچی اور اسے زمین پہ بٹھا کر اس پہ مرغیوں کا ٹاپا ڈھک دیا۔ پھر لپک جھپک دروازے پہ پہنچی، کنڈی کھولی۔ اس اچھال چھکا کی باتیں دیکھو کہ خصم کی صورت دیکھتے ہی اس پہ صدقے واری ہونے لگی اور خصم اُلو کی دم فاختہ لگاوٹ کی باتوں سے مست ہوگیا اور سمجھا کہ میری لگائی مجھ پہ سچ مچ ریجھی ہوئی ہے مگر (ایک ذرا توقف کے بعد بلند آواز سے پھر دہراتا ہے) مگر جب کہ دو ہاتھ لب بام رہ گیا تو کریال میں غلہ لگا۔ خصم کو ایکا ایکی اپنے کبوتروں کی یاد آئی بولا کہ ''آج صبح جو میں کبوتری لایا تھا اسے کہاں بند کیا ہے۔'' (آواز غیر معمولی حد تک دھیمی ہو جاتی ہے) وہ شفتل بولی کہ ''اسے چینی کے ساتھ بند کر دیا ہے۔'' وہ گھبرا کے بولا کہ ''ارے وہ تو اسے چونچیں مار مار کے گھائل کر دے گا'' وہ بولی کہ ''اجی میں کیا کرتی، کابک کا اور کوئی خانہ خالی ہی نہیں تھا۔'' (آواز پھر بلند ہو جاتی ہے) اس پہ وہ بولا کہ ''اور کوئی

خانہ خالی نہیں تھا تو اسے ٹاپے میں بند کر دیتیں'' اور یہ کہہ کے وہ آنگن کی طرف چلا۔ اب جو اس ڈھڈو نے یہ رنگ دیکھا تو اس کا رنگ فق ہوگیا اور اس کے آشنا کا دل ٹاپے کے اندر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔''

اس مقام پر پہنچ کر عطائی خاموش ہوگیا اور بڑے اطمینان سے اس نے مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ پورے مجمع پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا اور پنن پر تو بہت ہی کرب کی کیفت گزر رہی تھی۔ درحقیقت اسے اس نازک موقع پر عطائی کا رک جانا بہت ہی گراں گزرا۔ پنن ویسے تو ڈیڑھ بالشت کا لونڈا ہے، جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، لیکن عورتوں کے قصے کیسا کان لگا کر سنتا ہے۔ بڑا ہو کر تو جانے کیا حال کرے گا۔ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ بڑا ہو کر وہ سنبھل ہی جائے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پڑھ لکھ کر وہ بالزاک صاحب کی کہانیوں میں لگ جائے اور عطائیوں کی زبانی اسے تریا چلتر سننے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ حاشا وکلا ہمارا مقصد فریقین میں سے کسی پر حملہ کرنا نہیں ہے۔ یہ سرقہ ہے یا توارد، ہماری بلا جانے اور نہ ہمیں اس تحقیق سے مطلب کہ عطائی، بالزاک صاحب کے مرہون منت ہیں یا بالزاک صاحب عطائیوں کے خوشہ چین ہیں۔ اگر بالزاک مرحوم زندہ ہوتے تو نہ تو وہ ہمیں سلطنت بخش دیتے اور نہ کوئی عطائی ہمیں کچھ ڈھک داب کے دے دے گا۔ ہم کیوں کسی کے برے بنیں۔ ایک چلتی سی بات تھی سو کہہ دی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ذکر تو دراصل پنن کا ہے۔

خدا خدا کر کے وقفہ ختم ہوا۔ پنن کے دم میں دم آیا۔ لیکن اس کے مسئلہ کا حل پھر بھی نہ نکلا۔ عطائی اب گریز کر رہا تھا۔

''تو پھر اس رنڈی نے کیا کیا۔ تریا چلتر تو مشہور ہے۔ اس کا چرچا دور دور مشہور ہے۔ یہی قدرت کو منظور ہے۔ ہر زہر کا اتار ہے۔ عورت سانپ کی پھنکار ہے اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ کالے کا ڈسا جئے، اس کا کاٹا پانی نہ مانگے۔ مگر ہماری مٹھی میں بھی ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ تم سوچو گے۔ (یکا یک گرج کر کہتا ہے) تم سوچو گے کہ یہ شخص چھنالوں اور بیسواؤں کے قصے سنا سنا کر دلوں کو لبھاتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکتا ہے، پیسے بٹورتا ہے اور چلتا بنتا ہے۔ ہاں بھائی ہم نے ایسے

ٹھگ بھی دیکھے ہیں اور ایسے آنکھوں کے اندھے اور گانٹھ کے پورے بھی دیکھے ہیں جو ان کی ٹھگائی میں آ جاتے ہیں۔ پھر ہم نے لوگوں کو آنکھوں دیکھتے مکھی نگلتے بھی دیکھا ہے اور ابھی میں تمہیں اس خصم کا قصہ سنا رہا تھا جس کی آنکھیں گدی کے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ اس کا حشر کیا ہوا۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا (آواز پھر تیز ہو جاتی ہے) پہلے میں ان بدنصیبوں کا علاج بتاؤں گا جن کی آنکھیں ہیں پر ان میں گڑبڑ جھالا ہے۔ اے بھئی لمڈے باشا ذریوں ایک طرف کو ہو جا۔ ترکی ٹوپی والے بابو صاب آپ آگے تشریف لے آویں۔"

پٹن کو اس حملے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس قدر غیر اہم سمجھنے پر ہرگز آمادہ نہ تھا کہ دوسروں کے لئے جگہ خالی کرتا پھرے۔ وہ اپنی جگہ بدستور ڈٹا رہا۔ خیر ترکی ٹوپی والے بابو صاحب بھی اگلی صف میں آنے کے ایسے مشتاق نہیں تھے اور یوں بات ٹل گئی۔ درحقیقت عطائی نے تو اپنا فرض ادا کیا تھا۔ اس نے فرض کی ادائیگی میں جتنی پھرتی دکھائی تھی، اس کے نتائج سے اس نے اتنی ہی بے تعلقی اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہدایت اور درخواست کے ملے جلے فرض کا بوجھ سر سے اتار کر وہ فوراً اپنے بلہ سے لگ گیا۔

"آنکھوں والو انکھیاں بڑی نعمت ہیں۔

پارا مرے نا مرے گندھک نا دے تیل
مگر اب تم دیکھو قدرت کے کھیل

ہم نے ایک دوا تیار کی ہے۔ جالا ہو، پھولا ہو، دُھند ہو، موتیا بند ہو، رتوندا آتی ہو، دور کی چیز کم ٹیپتی ہو، کوئے میں کنکری سی پھرتی ہو، آنکھ سے پانی بہتا ہو، تپلی کا رنگ میلا پڑ گیا ہو، آنکھوں میں تر مرے آ جاتے ہوں۔ غرض کیسا ہی مرض ہو (گرج کر کہتا ہے) ایک سلائی ہمارے سرمے کی لگاؤ، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے" اور پھر یکا یک اس نے ایک لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی اور گرج کر پوچھا۔

"کیوں بھئی لمڈے تو نے ہمارا سرمہ لگایا تھا؟"

"ہاں لگایا تھا۔" لڑکے نے کچھ اس طرح سنبھل کر جواب دیا گویا وہ اس جملے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

"تو میاں لمڈے......"

یکا یک پٹن نے اپنا کان کھنچتا ہوا محسوس کیا۔ اسے اس مذاق پر بہت غصہ آیا۔ دراصل وہ یہی سمجھا کہ اس کا کوئی بے شعور دوست یہاں آن دھمکا ہے اور وقت موقع دیکھے بغیر اس سے دل لگی پر آمادہ ہے۔ اس نے بڑے تاؤ میں آ کر پلٹ کر دیکھا۔ مگر کیسا غصہ، کیسی برہمی، آنکھیں چار ہوتے ہی اس کی تو سٹی گم ہوگئی۔ اس کے ابا موقعہ واردات پہ آن نازل ہوئے تھے۔

پٹن ایک اسیر کی حیثیت سے گھر پہنچا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اس کے ابا اپنے فریضے سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اِک ذرا طنزیہ انداز میں کہا کہ

"لو یہ تمہارے بیٹے آ گئے۔"

امی نے پٹن کو تو بہت بے تکلفی سے اپنی سپردگی میں لے لیا لیکن پٹن کے ابا کا انداز گفتگو انہیں پسند نہیں آیا۔ انہوں نے ترخ کر جواب دیا۔

"خاک پڑے ایسے بیٹے پہ۔ اس کے ساتھ چیختے چیختے میرا دم ہوا تو ہو گیا، کبھی جو اس نے سودا وقت پہ لا کے دیا ہو۔ اجی وہ تو یہیں سے روتا بسورتا گیا تھا مٹا روتا جائے مرے کی خبر لائے۔ توبہ توبہ بُرے لچھن ہیں اس لونڈے کے۔"

چونکہ پٹن کی امی نے پٹن کو ہمیشہ لاتوں کے بھوتوں میں شمار کیا۔ اس لئے انہوں نے صرف باتوں پر قناعت مناسب نہیں سمجھی۔ بلکہ تشدد پر بھی اتر آئیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس وقت انہوں نے لاتوں سے نہیں بلکہ تھپڑوں سے کام لیا۔ مگر یہ تو محض تکنیک کا فرق ہوا۔ جہاں تک ان کے اعتراضات کا معاملہ ہے۔ ہم ان پر شروع ہی میں بحث کر چکے ہیں کہ روتا جائے مرے کی خبر لائے" کا الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ پٹن گھر سے روتا بسورتا روانہ نہیں ہوا تھا۔ پھر جائے کا دوسرا ٹکڑا بھی بے معنی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ پٹن ہلدی لے کر آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ دیر سے لایا۔ اگرچہ یہ بڑی جسارت آمیز بات ہے لیکن ہمیں کچھ ایسا شبہ گزرتا ہے کہ پٹن کی امی اس مثال کا محل استعمال نہیں جانتیں۔ ان کی زبان قینچی کی طرح ضرور چلتی ہے۔

لیکن قینچی کبھی کبھی غلط تو کاٹ جاتی ہے۔ زبان درازی اور زبان دانی میں زیادہ نہ سہی، تھوڑا بہت فرق تو ضرور ہے۔ اسی زبان درازی کی بدولت بہت سے ناکردہ گناہ بھی پنن کے گلے پڑتے دیکھے گئے ہیں۔ یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ پنن کی امی کی رضامندی سے بلکہ ان کی ترغیب سے کسی میلاد یا مجلس میں گیا لیکن بعد میں اس پہ ڈانٹ پڑی۔ اس قسم کے واقعات میں ایک یہ بات مشترک ہے کہ پنن کو ہجوم کی کثرت یا کسی اور وجہ سے تبرک سے محروم خالی ہاتھ گھر واپس آنا پڑا۔ ہم تو دراصل اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پنن کی امی کے طرزِ عمل میں افادیت پسندی کو بہت دخل ہے۔ یوں تھوڑا بہت افادیت پسند تو ہر انسان کو ہونا چاہئے لیکن اس سفوف کی مقدار میں ذرا اضافہ ہوا اور آدمیت کا قوام بگڑا۔ پنن کی امی کی طبیعت کے فساد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فعل کو نہیں دیکھتیں بلکہ نتیجے کو دیکھ کر اپنا فیصلہ صادر کر دیتی ہیں۔

پنن کا طور نرالا ہے۔ وہ نتیجے پر نظر نہیں رکھتا۔ اسے بس تفریح کی دھن رہتی ہے۔ مجمعوں اور بھیڑ بھڑکوں میں شرکت کا لپکا اسے کیسے پڑا، یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہم نے تو اتنا دیکھا کہ ہے کہ اس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے، گھر میں اسے خفقان ہوتا ہے۔ اپنی ذات کو اس نے انجمن کبھی نہیں سمجھا۔ انجمن کی تلاش میں وہ گلی کوچوں کی خاک اُڑاتا پھرا کرتا ہے۔ جہاں چار آدمیوں کو جمع دیکھا' کھڑا ہو گیا۔ لوگ ہنس بول رہے ہوں اور وہ نہ رُکے، یہ ناممکن ہے، خواہ وہ صادق پنواڑی کی دوکان ہو یا نتھیا سنار کا جھلنگا ہو یا پیاؤ کے سامنے عطائی کا مجمع ہو یا میلاد شریف ہو یا مجلس ہو...... چوپال میں جو مجلس ہوئی تھی وہاں اس کی مجمع پسند طبیعت اسے کھینچ کر لے گئی تھی۔ یہ پہلو اسے اس کی امی نے سمجھایا تھا کہ وہاں ملائی کے لڈو بٹیں گے۔ خیر اگر وہاں ملائی کے لڈو نہ بھی بٹتے تب بھی وہ ضرور جاتا۔ لیکن اب ہم خرما و ہم ثواب والی بات تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ملائی کے لڈو کی بنیاد پر اسے امی کی اخلاقی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔

پنن نے طے تو یہی کیا تھا کہ فی الحال باہر کھیلا جائے جب ماتم کا تاشہ بجے گا تو لپک کر اندر چلے جائیں گے لیکن مفت میں لڑائی گلے پڑ گئی۔ چھوٹا ڈیڑھ پسلی کا تو لونڈا ہے لیکن سمجھتا ہے اپنے آپ کو گاماں۔ یار لوگوں نے اسے پھونک دے دی۔ بس پھر کیا تھا۔ پھٹ پڑا۔ فتنے

کی جڑ دراصل اچھن تھا۔ اس نے چھوٹے کے کان بھرے کہ ''چھوٹے بیٹا پنن تجھے گالی دے رہا تھا۔'' چھوٹے کو حمیت کے ایسے مظاہرے کا موقعہ خدا دے، بس پنن سے بھڑ گیا۔ پنن نے بات کو بہت ٹالنا چاہا تھا، لیکن چھوٹا جب سر پہ ہی ناچنے لگا تو اس نے بھی ہاتھ چھوڑ دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اگر چہ جمیل اور جمیل کی قیادت میں سارے لڑکے اخلاقی حمایت چھوٹے کی کر رہے تھے اور خود چھوٹا بھی بڑے جذبے سے لڑ رہا تھا، لیکن پنن نے جیسے تیسے کر کے اسے پٹخ ہی دیا۔ لیکن اس شکست سے بھی چھوٹے کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ اس نے جھنجھلا کر پنن کی قمیص کا گریبان پھاڑ دیا اور پھر اس کے ہاتھ میں کاٹ کھایا۔ بہادری کے قوانین کی خلاف ورزی ہونے سے پنن کا دل ٹوٹ گیا اور یوں بھی اس کے ہاتھ میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ چھوٹے سے ہاتھ پیر چھڑا کر وہ الگ کھڑا ہو گیا لیکن چھوٹا بدستور چھنپھنا رہا تھا اور ایک مرتبہ پھر دو دو ہاتھ کرنے پہ آمادہ تھا۔ پنن نے مناسب یہی سمجھا کہ اس وقت یہاں سے گول ہو جائے۔

پنن نے اگر چہ چھوٹے کو پٹخنی دے دی تھی لیکن پھر وہ کچھ اس انداز سے چوپال میں داخل ہوا گویا میدان ہار کر آ رہا ہے۔ مجلس پورے عروج پر تھی۔ ذاکر کی تقریر میں بار بار پلٹے آتے تھے اور اس کے ساتھ چوپال کی فضائیں صلوٰۃ کے نعرے سے گونج اٹھتی تھیں۔ فرش پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ چاروں طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ سَروں کے اس دریا کی حدیں جہاں ختم ہوتی تھیں وہاں سے جوتیوں کی قطار کا کنارہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس سے چند قدم ہٹ کر چوکی پر گیس کا ایک ہنڈا رکھا تھا۔ جو بڑی مستقل مزاجی سے سنسنائے جا رہا تھا۔ پنن نے مجمع کی طرف رُخ کرنے کی بجائے ہنڈے کے قریب کھڑا ہو جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ چوکی پہ ننھے ننھے سبز کیڑوں کو دیکھ کر پنن کو یوں محسوس ہوا گویا کسی نے پتے کی ہوائیاں کر کے چوکی پر چھڑک دی ہوں۔ چند ایک خاکستری رنگ کے ٹڈے تھے جو بار بار بے معنی طور پر پھدکتے تھے اور پھر چوکی پہ رینگنے لگتے تھے۔ ان میں ایک بڑا سا سبز ٹڈا بھی تھا۔ پنن نے اسے پکڑنے کے لئے ہتھیلی تک کا زور لگا دیا۔ لیکن وہ ہاتھ ہی نہ آیا۔ آج اسے پے در پے ناکامیوں سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ اس ٹڈے کی ہٹ دھرمی نے اسے اور دل برداشتہ کر دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ چلو ایک آخری کوشش کر دیکھیں۔ اس نے بہت آہستگی سے

بہت چپکے چپکے ٹڈے کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے یقین تھا کہ ٹڈے نے اسے بالکل نہیں دیکھا ہے اور وہ کچھ ایسا ہی گم صم بیٹھا تھا گویا اسے پٹن کی سازش کا بالکل علم نہیں ہے۔ یکا یک پٹن نے چوکی پہ زور کا ہاتھ مارا۔ ٹڈا بڑے اطمینان سے پھدک کر گیس کی سلاخ پہ جا بیٹھا لیکن چوکی کی کیل سے بے چارے پٹن کا یہ دوسرا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ ادھر سے مجمع میں سے چند آدمیوں نے اسے جھڑکا۔ ایک شخص نے تو اسے کھلا نوٹس دے دیا کہ ''ارے اولڑکے یا تو چپکا ہو کے مجلس میں بیٹھ نہیں تو یاں سے بھاگ جا۔'' پٹن کو ان لوگوں کا یہ اندازِ گفتگو مطلق نہ بھایا۔ لیکن کیا کیا جاتا۔ آج تو ہوا کا کچھ رُخ ہی بدلا ہوا تھا۔ سارا زمانہ اس کی مخالفت پہ آمادہ تھا۔ اس نے ٹھہی باندھی کہ فوراً چوپال سے باہر نکل جائے۔ لیکن وہ پھر جائے کہاں۔ مجلس ختم کیے بغیر گھر لوٹ جانے کی کوئی تک ہی نہیں ہے اور چوپال کے باہر چھوٹا اور اس کے لگو بھگو کھڑے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ رک گیا اور چار و ناچار مجلس میں جا بیٹھا۔

فخر الواعظین سید تقن صاحب نے بھی وہ مجلس پڑھی کہ مجمع بچھ بچھ گیا اور صلوٰۃ کے نعرے بلند کرتے کرتے لوگوں کے گلے پڑ گئے (انہوں نے مجلس پڑھنے کے صرف دو سو روپے لئے تھے اور ان دو سو روپوں کے متعلق بھی انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ ''مجھے ان کے ذکر سے یہ رقم ملی ہے ان ہی کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔'' چنانچہ اس بات کے عین شواہد موجود ہیں کہ انہوں نے دوسرے ہی دن ڈاک خانے سے منی آرڈر فارم منگایا تھا تاکہ یہ روپے حسینی مشن کو بھیج دیئے جائیں۔) پٹن تھوڑی دیر تک تو اپنے خیالات میں غلطاں سر جھکائے بیٹھا رہا لیکن (مرحب) کے لفظ پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ خیبر کی لڑائی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ کیسے تلوار چلی، مرحب پہ کیا بیتی، جبریل امین کے پروں پہ کیا گزری اور زمین کا سینہ ایک لمحے کے لئے کیسے شق ہوا اور اس کی توجہ تقریر کی طرف مبذول ہو گئی۔ تقن صاحب قبلہ اپنے مخصوص فصیح و بلیغ لہجہ میں فرما رہے تھے......''اور اِدھر خاتم المرسلینؐ نے نادِ علی پڑھی اور ادھر اخی رسول، زوجِ بتول، صاحبِ انما، شاہِ لافتا، بابِ مدینۃ العلم، پیکرِ اخلاص و حلم، ساقیِ کوثر، حیدر صفدر، فخر عرب رشک عجم نصیریوں کا خدا، شیعوں کا ناخدا، امیر المومنین، امام المتقین، اسد الغالب علی ابن ابی طالب اسپ صبار فتار پہ سوار ہوئے، گویا آفتاب بام پہ

بلند ہوا، حوروں نے غرفوں سے جھانکنا شروع کیا۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئیں، منزلیں ٹھٹھک گئیں، وقت سہم کر رک گیا۔ رہوار نے اشارے کو قمچی سمجھا۔ ادھر اس کے قدم اٹھے ادھر لشکر اسلام میں ٹاپوں کی آواز گونجی۔ رسولؐ بولے کہ مسلمانو مبارک ہو فاتح خیبر آ......'' صلوٰۃ کے شور میں پٹن یہ نہ سن سکا کہ فقرہ کس لفظ پر ختم ہوا۔ مگر اس لفظ کے خبط ہو جانے سے مطلب تو خبط ہوتا نہیں تھا۔ ممکن ہے خود تقن صاحب نے ہی یہ سوچ کر اس لفظ کو گول کر دیا ہو آخر انہیں سانس بھی تو لینا تھا لیکن اس صلوٰۃ سے پٹن کا دھیان پھر بٹ گیا۔ جانے کتنی دیر اس کا تصور طیش اور غصے سے بھرے ہوئے جذبات کی دنیا میں سرپٹ دوڑتا رہا۔ وہ اس وقت چونکا جب درِ خیبر ٹوٹ چکا تھا اور تقن صاحب ایک للکار کے انداز میں فرما رہے تھے۔

''تاریخ عالم خاموش ہے، دنیا کے سپہ سالاروں کی صفوں میں سناٹا ہے، رستم، سکندر اور نپولین کے مدح خواں کہاں ہیں، کہاں ہیں انسانی طاقت کی کوتاہیوں پر بحث کرنے والے فلسفی کہاں ہیں انسانی اعضاء کی کوتاہیوں پہ غور کرنے والے انگریز سائنس دان آئیں اور آ کر دیکھیں کہ فاتح خیبر کی دو انگلیوں پر وہ آہنی باب بلند ہے جسے چالیس قوی ہیکل، عظیم الجثہ اشخاص بند کرتے تھے اور باز کرتے تھے اور یہ انگلیاں اس آہنی باب میں یوں در آئی ہیں جیسے آٹے میں انگلیاں در آتی ہیں۔''

پٹن چند منٹ تک تو بڑی یکسوئی سے ان فقروں کو سنتا رہا لیکن رفتہ رفتہ قطعی غیر محسوس طور پر انجن پھر پٹڑی پر سے اتر گیا۔ البتہ پٹن نے اس مرتبہ اعتدال پسندی سے کام لیا۔ چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ اس نے ایک پھریری لی اور دھیان کو مار پیٹ کے پھر رستے پہ ڈال دیا۔ لیکن اب ادھر انجن پٹڑی بدل چکا تھا۔ تقن صاحب قلعہ خیبر سے گریز کر کے ساحل فرات پر کیونکر آ گئے۔ اس نکتے پر پٹن نے مغز پچی کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ گریز کا یہ انداز کوئی ایسا نیا تو تھا نہیں۔ سلسلے کی ساری کڑیاں اس کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ بلکہ وہ شاید اس مرحلے کا منتظر ہی تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ اس موڑ پر آ کر مجلس جلد ختم ہو جایا کرتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ پٹن آج اپنے مولا کی خدمت میں اپنے ناچیز آنسوؤں کی نذر پیش کرنا چاہتا تھا۔ اسے مجلس میں روئے ہوئے مدتیں ہو گئی تھیں اول تو وہ بالعموم باہر کھیلتا رہ جاتا تھا اور

تاشے کی آواز بلند ہونے کے بعد امام باڑے میں داخل ہوتا تھا اور اگر وہ کبھی کبھار دل پہ جبر کر کے مجلس کے دوران میں اندر پہنچتا بھی تھا تو ایسے موقعہ پر کہ مصائب شروع ہو چکے ہوتے تھے۔ اب رقت کی کیفیت منٹ دو منٹ میں تو طاری نہیں ہوا کرتی۔ جس بدنصیب کے کان فضائل سننے سے محروم رہے ہوں، اس کا سینہ مصائب کے اثر سے کیا معمور ہوگا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجلس میں شور وشین بپا ہے اور پنن میاں ہونق بنے بیٹھے ہیں۔ مجمع دھاڑیں مار رہا ہے۔ ذاکر اپنا آپ دھنے جا رہا ہے، اور پنن صاحب سوچ رہے ہیں کہ کب مجلس ختم ہو اور کب تبرک بٹے۔ اگرچہ اس نے اس روش پر اپنے آپ پہ بہت لعنت ملامت بھی کی ہے اور اکثر مرتبہ اپنے لئے شمر اور یزید کی تشبیہیں بھی استعمال کی ہیں لیکن ملامت اور ندامت کے یہ لمحے ہمیشہ مجلس ختم ہو جانے کے بعد آئے۔ مجلس میں تو ادبدا کر اس کا دھیان بٹ جایا کرتا ہے۔ خیر آج وہ ضرور رونے پہ مائل تھا۔ اس وقت اسے نہ تو مجلس کے ختم کا انتظار تھا اور نہ گھر پہنچنے کی جلدی تھی، نہ کھیل کود کی دھن تھی اور نہ ملائی کے لڈوؤں کا خیال باقی تھا۔ ان تمام سفلی خواہشات سے اس کا سینہ پاک ہو چکا تھا۔ وہ صرف اور محض رو رہا تھا۔ درحقیقت اسے رونے میں یہ بھی ہوش نہ رہا تھا کہ تقن صاحب بیان کیا کر رہے ہیں۔ ان کے چند ایک فقرے اچٹتے ہوئے اس کے کان میں پڑے تھے اور یوں ایک تصویر مرتب ہو کر اس کے ذہن میں جم گئی تھی۔ گویا امام حسین تن تنہا دشمنوں کے نرغے میں کھڑے ہیں، ان کا سارا گریبان چاک ہے اور ان کے زخمی انگوٹھے سے خون کی تلیاں بہہ رہی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تصویر اس کے ذہن میں دھندلی پڑنے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے آنسوؤں کا تار بھی ٹوٹنے لگا۔

رو دھو کے اس نے اپنی طبیعت کا سارا غبار دھو ڈالا۔ مینہ بند ہونے کے بعد جس انداز سے مرغیاں اور کبوتر اپنی گردن پھلاتے اور جھاڑتے ہیں کچھ اسی انداز سے پنن نے ایک پھریری لی اور گردن اٹھا کر مجمع پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی لیکن اسے فوراً ہی اپنی لغزش کا احساس ہوا۔ دراصل اس نے یہ اندازہ لگانا چاہا تھا کہ مجلس ابھی کتنی اور کھنچے گی۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ حاضرین کو اپنے تن بدن تک کا ہوش نہیں ہے تو اسے اپنی اس ہوشمندی اور بے اطمینانی پہ سخت پشیمانی ہوئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور تہہ دل سے رونے کی کوشش کرنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود اس کے آنسو نہ نکلے تو وہ پھر کسمسایا۔ اس کے بالکل قریب

دیوان جی بیٹھے تھے اور بے تحاشا اپنا آپ پیٹ رہے تھے۔ پہلے تو وہ ان کی کالی کلوٹی گردن کی پھولی ہوئی بھدی رگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ ان کے چہرے کے بگڑے ہوئے خطوط پہ جا ٹکی۔ دیوان جی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے سینے پہ ہاتھ مارتے اور منہ بگاڑتے تھے کہ پنن کو بے تحاشا ہنسی آ گئی لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اسے اپنے اس گناہ پر سخت غصہ آیا اور غصے سے زیادہ اسے عذاب کے خوف نے ستایا۔ اسی موقعہ پر اسے یہ بات یاد آئی کہ بی بی فاطمہ ہر مجلس میں آتی ہیں اور اپنے سیاہ ریشمی رومال میں رونے والوں کے آنسو جمع کر کے جنت میں لے جاتی ہیں۔ اس خیال سے اسے بہت تحریک ہوئی۔ وہ پوری یکسوئی اور جوش سے رونے پہ آمادہ ہو گیا ایک مرتبہ اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو آ گئے تھے لیکن جب اس نے اپنے کرتے کے دامن سے انہیں پونچھنے کی کوشش کی تو نہ جانے وہ کدھر سٹک گئے۔ جب آنکھوں نے اس کے ساتھ یہ سراب کا سا کھیل کھیلنا شروع کیا تو وہ ان سے بالکل بیزار اور متنفر ہو گیا۔ پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھایا کہ آنسو نہیں نکلتے نہ سہی بخشش تو رونے والوں کا سامنہ بنانے والوں کی بھی ہو گی۔ رونے والوں کا سامنہ بناتے بناتے پنن کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

تقن صاحب منبر سے کب اترے اور مجلس کب ختم ہوئی، پنن کو اس کی کیا خبر، وہ تو بس اتنا جانتا ہے کہ کسی شخص نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

”ارے لونڈے گھر جا اپنے مجلس ختم ہو گئی۔ ہمیں فرش تو لپیٹ لینے دے۔“

اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور نیم غنودگی کے عالم میں گھر کی طرف چل پڑا۔ درحقیقت اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب اس کی امی نے اسے لگے ہاتھوں لیا۔ ان کا سب سے پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مجلس تو گھنٹہ بھر ہوا ختم ہو چکی، وہ اتنی دیر کہاں رہا۔ لیکن یہ کوئی بنیادی اعتراض نہ تھا۔ اگر پنن ملائی کا لڈو لے کر آتا تو ممکن ہے، سرے سے یہ اعتراض پیدا ہی نہ ہوتا۔ پر پنن نے بھی ستم کیا۔ لوگ مجلس میں جاتے ہیں تو کچھ لے کر ہی آتے ہیں۔ پنن ایک تو خالی ہاتھ پھرا اور اوپر سے اپنا کرتا پھٹوا آیا۔ رہا ثواب کا معاملہ سو پنن کی امی کم از کم پنن کے سلسلے میں اس قدر کو کبھی خاطر میں نہیں لائیں۔

پنن کی مستقل مزاجی اور عزم کی بھی داد دینی پڑے گی۔ پٹنے کٹنے کو اس نے ہمیشہ یہ

سمجھا کہ اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب چوک میں جلسہ ہوا تو وہ پھر گیا اور ڈنکے کی چوٹ گیا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت اس کی امی پڑوسن سے دیوان جی کی بیٹی کی منگنی ٹوٹ جانے کے الجھے ہوئے مسئلے پر گفتگو کرنے میں ایسی غرق تھیں کہ انہیں اپنی ہی سدھ نہ تھی، پنن کے گھر سے نکلنے کی انہیں کیا خبر ہوتی۔ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ دیوان جی کی بیٹی کا مقدمہ درپیش نہ ہوتا تو وہ گھر سے نکلنے کا کوئی اور طریقہ نہ نکال لیتا۔

لیکن پنن نے اس جلسہ میں شریک ہو کے بھی فیض نہ پایا۔ وہ دراصل یہی نہ سمجھ سکا کہ مجمع ہے کس ڈھب کا۔ وہ مجلس تو یقیناً نہیں تھی اور نہ وہ میلاد شریف تھا۔ پھر اسے عطائیوں کا مجمع بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آپ تقریر کے رنگ ڈھنگ کے بارے میں کچھ بھی کہیں اور موضوع کا موازنہ کسی بھی دوائی یا نسخے سے کریں لیکن سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مقرر کے ہاتھ میں کوئی شیشی نہیں تھی اور جس مقرر کے ہاتھ میں شیشی نہ ہو اسے کم از کم پنن تو عطائی نہیں مان سکتا تھا۔ پھر پنن کوشش کے باوجود اس نکتے کو حل نہ کر سکا کہ 'آم' میں واؤ کی آواز کب سے شامل ہو گئی اور اگر چلو ہو بھی گئی تو عطائیوں کو آموں سے کیا مطلب۔ یہ تو کمہار کی گدھی اور رام کے اجتماع کی سی بات ہوئی۔ بہر حال بیچارہ پنن اسی ادھیڑ بن میں رہا اور ادھر مقرر صاحب تھے کہ فراٹے بھر رہے تھے۔

”جو لوگ غیر جانبداری کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں وہ فراری ہیں، وہ بزدل ہیں وہ بھگوڑے ہیں، وہ اُبھرتی، بپھرتی پھیلتی ہوئی زندگی سے خوف زدہ ہیں۔ وہ اُمڈتی، لہراتی، گنگناتی سرخ آہنی عوامی طاقت سے ہراساں ہیں۔ آج دنیا میں صرف دو کیمپ ہیں۔ جنگ بازوں کا کیمپ اور امن پسندوں کا کیمپ۔ جنگ بازوں کے کیمپ میں مغرب کے سامراجی ممالک، ان کے پٹھو، ان کے حاشیہ نشین اور غاشیہ بردار، ان کے سرمایہ دار ایجنٹ، ان کے فرقہ پرست اور فسطائیت پسند دلال شامل ہیں۔ دوسری طرف اسٹالن اور ماؤزے تنگ اور لوئی اراگوں اور پبلو نرودا اور ہیولٹ جانسن ہیں۔ سرخ سویرا ہے، دھرتی کی کوکھ سے جنم لیتا ہوا نیا انسان ہے، جاگتا ہوا ایشیا ہے، بھوک اور فاقوں کے ستائے ہوئے کروڑوں عوام ہیں۔ عوام اور مزدور اور کسان جنگ نہیں چاہتے۔ ان کا نعرہ ہے ”روٹی۔ امن اور اشتراکیت“ امن کی اپیل پر پانچ کروڑ

عوام نے دستخط کئے۔ ویانا کی امن کانگریس میں پانچ ہزار پانچ سو فاختائیں اُڑائی گئیں۔“

فاختہ اڑانے کے جملے پہ پنن کے کان کھڑے ہوئے۔ ساری تقریر میں یہی ایک فقرہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ اب تک تو وہ کچھ ہونق بنا بیٹھا تھا۔ ہیولٹ جانسن، پبلو نرودا، لوئی اراگوں، ماؤزے تنگ، مارشل اسٹالن...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا آلہ دین کی کہانی والا افریقی جادوگر پھر زندہ ہو گیا ہے اور ان طلسماتی ناموں اور لفظوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی تڑاخ سے زمین پھٹے گی اور پڑاخ سے وہ اس میں جا پڑے گا۔ اس کے بالکل پیچھے نواقلی بھی بیٹھا تھا جسے کئی مرتبہ زور زور سے نعرے بھی لگاتے دیکھا تو پنن کو اس کی علمیت اور قابلیت کا لوہا ماننا ہی پڑا۔ البتہ جب فاختہ اڑانے کا فقرہ آیا تو اس نے بڑے فخر سے گردن اونچی کر کے نواقلی کی طرف دیکھا۔ کم از کم ایک فقرہ تو وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ لیکن پانچ ہزار پانچ سو پچپن کے ہندسے پر اس کی عقل چکر کھا گئی۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ چھوٹے نے اس کی فاختہ اڑائی تھی تو اسے میا یاد آ گئی تھی اور ڈیڑھ منٹ تک اسے چاند سہلانی پڑی تھی۔ وہ کون سی مائی کے لال تھے۔ جن کے سروں پر ایک ساتھ پانچ ہزار پانچ سو پچپن فاختائیں اُڑائی گئیں اور وہ دم سادھے بیٹھے رہے۔ پنن نے بہت صبر کیا۔ لیکن یہ جلسہ تو یوم قیامت بن گیا۔ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا۔ نیند تو خیر اب اس کی آنکھوں میں کہاں تھی۔ البتہ تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مقرر اب بہک کر کسی اور طرف نکل گیا تھا۔

”بڑھتی ہوئی بے روزگاری ختم کیسے ہو سکتی ہے۔ روز افزوں معاشی بدحالی کا علاج کیا ہے۔ جنگ اور بھوک اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی ستائی ہوئی انسانیت کے درد کا درماں کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا واحد جواب ہے“

اور پنن کو یوں محسوس ہوا گویا پیاؤ کے سامنے آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں۔ لیکن ابھی وہ اتنا ہی سوچ رہا تھا کہ ایک ساتھ تالیاں بجنے لگیں اور وہ چونک پڑا۔ اس نے ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ درحقیقت وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تالیاں کس کے پیچھے پٹ رہی ہیں۔ اوّل

تو اسے تالیاں پیٹنے کا یہ انداز ہی پسند نہیں آیا۔ لیکن یہ دیکھ کر تو وہ اور بھی چکرایا کہ نصف منٹ کے تالیوں کے شور کے بعد مجمع کو سانپ سونگھ گیا اور تقریر پھر شروع ہوگئی۔ مقرر کے لہجے میں رقت اور سوز کے ساتھ ساتھ اب فصاحت و بلاغت بھی پیدا ہو چلی تھی۔

''ماں کی کوکھ اور دلہنوں کا سہاگ، بہنوں کی مانگ کا سیندور اور بیٹیوں کی عصمت بچوں کی معصومیت اور جوانوں کی بھری جوانیاں ، انسانیت کی دیوی اور تہذیب کی سہاگن تم سے امن کی بھیک مانگتی ہے۔ جنگ باز سامراجی اور ان کے سرمایہ دار پٹھو بلکتی ہوئی انسانیت کو سسکتے ہوئے عوام کو جنگ کی آگ میں دھکیل......''

پٹن نے بہت صبر کیا، لیکن صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پٹن آخر پٹن تھا۔ بس وہ بے چین ہو کر اُٹھ ہی تو کھڑا ہوا۔ نواقلی نے اسے ڈپٹا۔ لیکن پٹن بھی سر پر توا باندھ کر کھڑا ہوا تھا۔ ڈانٹ پھٹکار کا اس پہ ذرا اثر نہ ہوا۔ لیکن قسمت کی بات کہ وہ اچک کر جب آگے چلا تو مجمع میں ایک کسان کے پاؤں پہ اس کا پیر پڑ گیا۔ اس اجڈ نے ایسا دھکا دیا کہ بے چارہ منہ کے بل گرا۔ اس لپیٹ میں کئی آدمی آ گئے۔ چند ایک کھڑے ہوگئے۔ چند ایک نے پٹن کی گالیوں سے تواضع شروع کی۔ ادھر سے والنٹیر بیٹھو بیٹھو کا شور مچاتے ہوئے لپکے۔ بس پھر کیا تھا۔ جلسے میں گڑ بڑ مچ گئی۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی بیٹھا بیٹھا ہی چلا رہا ہے۔

پٹن جیسے تیسے کر کے جلسہ گاہ سے نکلا۔ گیٹ پر ایک والنٹیر کہہ رہا تھا کہ

''یہ ساری کارستانی سی۔ آئی۔ ڈی والوں کی ہے۔''

لیکن جس شخص کے گلے میں چمڑے کا بیگ پڑا تھا، اس نے کہا کہ:

''یہ سی ۔ آئی ۔ ڈی کیا ہے۔ یہ تو ایک بہت وسیع مشینری کا ایک چھوٹا پرزہ ہے۔ دراصل اس جلسے میں انتشار پھیلانے کی غرض سے امریکی قونصل نے غنڈوں کی جیبیں بھری تھیں۔''

پٹن کی آنکھوں میں تر مرے آگئے۔ آج وہ مسلسل ایسی باتیں سن رہا تھا جو اس کی سمجھ سے بالا تر تھیں۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ یکا یک عالم بالا سے اس کا رابطہ قائم ہو گیا ہے اور جناتی زبان بے تحاشا اس کے کانوں میں انڈیلی جا رہی ہے۔ ممکن ہے وہ کچھ دیر اور کھڑا رہتا

اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ لیکن دھما چوکڑی میں اس کا پاؤں بری طرح کچل گیا تھا اور سر کا درد مستزاد۔ اس نے مناسب یہی سمجھا کہ جس طرح بھی ہو یہاں سے چل دو۔

پٹن کا حال اتنا بے حال ہو چکا تھا کہ چھوٹا تو اسے دیکھتے ہی بے ساختہ ہنس پڑا۔ ایک دولڑکوں نے اسے لنگڑ دین کے خطاب سے نوازا۔ وہ کلیجہ مسوس مسوس کر رہ گیا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ لڑنا تو درکنار اس وقت اسے بات کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ پھر چھوٹے کی پارٹی کے سامنے اس کی کب پیش گئی تھی۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اس نے سنی ان سنی کی اور سیدھا گھر کو ہولیا۔

پٹن جب گھر کے دروازے پر پہنچا تو چوکھٹ نے یکا یک اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس وقت اس کے نفس کے اندر بہت کشتم کشتا ہوئی۔ پہلے تو وہ ٹھٹکا۔ پھر اس نے سوچا کہ تذبذب کے عمل کو کیوں طول دیا جائے، ہٹاؤ اس قیامت کو بھی آ لینے دو اور یہ قیامت ٹلنے والی تھوڑا ہی ہے۔ اب نہیں، پندرہ بیس منٹ بعد آئے گی۔ وہ ہمت باندھ کر اندر گھسنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں اس کی امی کی آواز بلند ہوئی۔ اس کا دل دہل گیا۔ اگرچہ اس وقت ان کا روئے سخن ان مرغیوں کی طرف تھا۔ جنہوں نے اپنے گندے پنجوں سے دھلی ہوئی سل کو خراب کر دیا تھا۔ مرغیاں تو بڑی لاپرواہی سے کٹ کٹ کرتی ہوئی گھر سے باہر ٹہل گئیں، پٹن کی بزدلی دیکھئے کہ محض امی کی آواز سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو رونے والا ہو گیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ محض امی کی گرج دار آواز نہ ہو۔ خیر جو کچھ بھی ہو پٹن نے دوباری کے ایک کونے میں منہ دے کر ٹسر ٹسر رونا شروع کر دیا۔ پٹن کی امی مرغیوں کے چکر میں دروازے تک آ گئیں۔ اس حادثے نے پٹن کو اور بوکھلا دیا۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا گلا بھی کام کرنے لگا۔ لیکن امی کسی نیک جون میں تھیں یا پھر پٹن کا حال پتلا دیکھ کر ان پہ کچھ اثر ہوا اور وہ مامتا جو گھوڑے بیچ کر کبھی کی سوگئی تھی یکا یک جاگ اٹھی۔ انہوں نے چند ایک تنبیہی فقرے تو ضرور کہے بلکہ سچ پوچھئے تو ان فقروں میں تنبیہہ سے زیادہ مامتا کی محبت کارفرما تھی۔ پیر کی زخمی انگلی پہ پٹی باندھتے ہوئے انہوں نے بڑی دل سوزی سے کہا تھا کہ!

''ڈوبا بخت مارا۔ وای توائی خاک پھانکتا پھرے ہے۔ کسی روز آنکھ ناک توڑ کے لائے

گا۔ باوا کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں ہے کہ بیٹے کا علاج کرالیں گے۔ بس کھٹیا پہ پڑا سڑا
کرے گا۔ کوئی دو کوڑی کو نہ پوچھے گا۔ تب مجھ بندی سے کہیو کیا کہتی تھی۔"

پنن نے اس طرزِ عمل کو بہت غنیمت سمجھا۔ وہ تو جی جان سے بیزار ہو ہی چکا تھا مگر اس غفورالرحیم کی کارسازی کے قربان جایئے۔ اس نے امی کے دل میں رحم ڈال دیا، ورنہ قیامت آنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔

یہ تو نہیں کہ جا سکتا تھا کہ اس واقعہ سے پنن کی اصلاح ہوگئی۔ چکنے گھڑے پہ پانی بھلا کہاں ٹھہرتا ہے اور امی کی نصیحتیں آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ایک کان سے سنی گئیں اور دوسرے کان سے اڑائی گئیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ پنن اب مجمعوں میں کچھ کچھ امتیاز کرنے لگا ہے۔ چوک میں جلسے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اب وہ ادھر بھولے سے بھی نہیں جاتا ہے۔ البتہ جب پیاؤ کے سامنے مجمع لگتا ہے تو پنن کسی نہ کسی طور وہاں ضرور پہنچ جاتا ہے خواہ اس کی امی گھر کو سر پر اٹھائیں یا گھر کے برتن باہر پھوڑیں۔ نمازیوں کی نمازیں قضا ہوتے اکثر دیکھی گئی ہیں۔ پابند روزہ دار بھی بعض وقت محض سحری گزر جانے کی وجہ سے روزہ ٹلا جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پیاؤ کے سامنے مجمع لگا ہو اور پنن نے وہاں حاضری نہ دی ہو۔

اس میں دراصل پیاؤ کی تخصیص نہیں ہے۔ مجمع جہاں بھی لگتا ہے پنن سونگھتا سونگھتا وہاں پہنچ ہی جاتا ہے۔ پچھلی پینٹھ پر یہ ہوا کہ ایک نیا عطائی یہاں آ نکلا تھا۔ اس نے پیاؤ کی بجائے پینٹھ میں مجمع لگایا۔ پنن کے فرشتوں کو بھی اس کا پتہ نہ تھا۔ یوں سمجھیے کہ وہ تو محض آگ لینے گھر سے نکلا تھا۔ لیکن پینٹھ میں پیمبری اس کا انتظار کر رہی تھی اور گھر میں آئی لکشمی کو دھکے تو نہیں دیئے جاتے۔

پارے والے کی بازی گری تک تو پنن خاطر ہی میں نہیں لایا اور کیوں لاتا، وہ چوٹ بھی تو کھا چکا تھا۔ پیسے کا پارہ خریدا، خوب گھس گھسا کے دھیلے کو چونی اور پیسے کو اٹھنی بنایا اور پھر وہ اپنی شکل پہ آ گئے۔ پنن باؤلا تھوڑا ہی تھا کہ پھر اس کی باتوں میں آ جاتا۔ چنانچہ اس نے پارے والے کا تماشا بس ڈیڑھ دو منٹ دیکھا اور پھر آگے چل پڑا۔ تالاب سے پرے ایک بھینس اور بھینسے کے گرد بہت سے لوگ حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ پنن نے بھی بڑے اشتیاق اور انہماک کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جب کافی دیر ہوگئی اور بات بننے میں نہ آئی تو اس کا دل بجھ

گیا۔ اسے بھینسے کی سستی اور کاہلی پر سخت غصہ آیا اور وہ حلقے سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ آخر اسے شکر قندیاں خرید کر گھر بھی تو واپس ہونا تھا۔

ڈاک خانے کے قریب املی کے درخت کے نیچے لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر پنن بہت چونکا۔ اگرچہ مجمع بہت تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پہ اڑا کھڑا تھا لیکن پنن تو مجمع میں گھسنے کا گر خوب جانتا ہے۔ کچھ اس کی مردانہ ہمت عود کر آئی۔ کچھ مدد خدا ہوئی اور وہ جیسے تیسے کر کے اگلی صف میں جا ہی پہنچا۔ تمہید ختم ہو چکی تھی۔ تقریر اب گریز کی منزل میں تھی۔

"تم سوچتے ہوگے کہ یہ کوئی مداری ہے، ڈنڈا گھمائے گا، ٹوپی سے خرگوش نکالے گا اور پیسے بٹورے گا۔ مگر جناب عالی!! ایسا نہیں ہے۔ پھر تم سوچو گے کہ اچھا تو یہ شخص کسی لونڈے پر مسمریزم کرے گا اور اس سے دل کا حال پوچھے گا۔ مگر میری سرکار! یہ بات بھی غلط ہے۔ پھر تم کہو گے کہ اچھا تو ہو نہ ہو یہ کوئی لیڈر ہے۔ ووٹ مانگے گا، چار گالیاں دے گا۔ چار گالیاں کھائے گا اور چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ مگر میرے حضور! تم سے پھر چوک ہوئی۔"

(گرج کر)

"ہم نہ مسخرے ہیں نہ مداری ہیں نہ لیڈر ہیں نہ گرہ کٹ ہیں (آواز یکایک دھیمی پڑ جاتی ہے) اب تم پوچھو گے کہ پھر بابا تم کون ہو۔"

عطائی نے چند لمحے توقف کیا اور پورے مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد اس نے ایک پھریری سی لی اور بولنا شروع کر دیا۔

کیا ہی کنڈلی مار کے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا
رات بھر چوٹی کے بدلے سر مروڑا سانپ کا

کمال دیکھو کمال والوں کا جمال دیکھو جمال والوں کا
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ، پیو چلے جاؤ

آخری شعر پڑھتے پڑھتے اس نے بہت پھرتی سے شیشوں کی قطار میں سے ایک شیشی

اٹھائی اور اسے ہاتھ میں گھما کر بولا۔

''اس شیشی میں کیا ہے (وقفہ) اس میں ایک دوا کی کمی ہے۔ وہ دوا ہمیں معلوم ہے مگر استاد نے کہہ دیا ہے کہ بیٹا وہ دوا ملائے گا تو اندھا ہو جائے گا۔ کوڑھی ہو جائے گا۔ در در بھیک مانگے گا۔ سو ہم نے وہ دوا نہیں ملائی۔ کسی نوجوان کے یہ دوا لگاؤ، سوزش ہو، جلن ہو ٹیسیں اٹھتی ہوں، پیپ بہتی ہو، زخم پڑ گئے ہوں، سب پلک مارتے صفاچٹ، آدمی چاق و چوبند، رات کو مزے سے سوئے گا،

صبح کو ہمیں تمہیں گود پھیلا کر دعائیں دے گا۔''

وہ چند لمحوں کے لئے پھر رُکا۔ مجمع کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر گویا ہوا۔

''یہ نیم حکیمی خطرہ جان نہیں ہے، ہم پیشہ ور طبیب نہیں کہ گل قند کی جگہ گل بنفشہ اور گل بنفشہ کی جگہ سپستان لکھ دیا۔ ہم نے خلق خدا کے فائدے کے لئے یہ جوگ رچایا ہے۔ لوبھ سے فقیروں کو کیا مطلب۔ پیسہ کوڑی پر لعنت بھیجتے ہیں۔ قیمت لینا حرام سمجھتے ہیں۔ خلقت کو اس پاک پروردگار کے نام پہ مفت بانٹتے ہیں۔ جسے حاجت ہو وہ ہاتھ اٹھادے گا۔ جو شرمائے گا بعد میں پچھتائے گا۔''

مجمع میں ایک حرکت ہوئی۔ یوں معلوم ہوا کہ مکھیوں کا کوئی بڑا سا چھتہ ٹوٹ پڑا ہے اور بہت سی مکھیاں آوارگی کے عالم میں بھنبھنا رہی ہیں۔ پٹن کے پیچھے ایک شخص تہد باندھے بنیان پہنے کھڑا تھا۔ اس نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

''پیارے...... مفت مل رئی اے۔ چپڑی اور دو دو۔''

ساتھی نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کرتے ہوئے کہا:

''یار اس سے وس بات کی بھی دوائی پوچھ لے نا۔''

عطائی کی آواز پھر بلند ہوئی:

''دوستو۔ نوجوانو! جوانی بڑی نعمت ہے۔ مگر آج کل کے نوجوان (آواز بلند ہو جاتی ہے) مگر آج کل کے نوجوان جوانی کو مفت میں بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اپنی جان کو

روگ لگا لیتے ہیں۔ پھر ہاتھ ملتے ہیں۔ مگر ہم نے یہ نئی دوا ایجاد کی ہے۔ اس سے سارے روگ خاک کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔ یہ دوا اس پاک پروردگار کے نام پہ ہم مفت بانٹتے ہیں جسے حاجت ہو وہ ہاتھ اٹھادے جو شرمائے گا بعد میں پچھتائے گا۔''

اور یکا یک مجمع میں بہت سے ہاتھ بلند ہو گئے۔

ہاتھ پٹن نے بھی اٹھایا تھا لیکن عطائی کی بات دیکھئے کہ اس نے دوائی بانٹی اور پٹن کو نظر انداز کر گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ عطائی کا منہ نوچ لے اور اس کی ساری شیشیاں لے کر گھر بھاگ جائے پہلے تو اسے گمان ہوا کہ شاید عطائی نے اسے دیکھا نہ ہو۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ آخر تہد والا شخص اور اس کا ساتھی بھی تو اسی کے برابر کھڑے ہیں اور دونوں کو اس نے ایک شیشی دی ہے۔ آخر ان میں ایسے کیا لعل ٹنکے ہوئے ہیں اور اس میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔ معاملہ دراصل شیشی کا نہیں تھا، پٹن کو تو اس پر غصہ آ رہا تھا کہ عطائی نے اس کی توہین کی۔ وہ منع ہی کر دیتا تو بھی ایک بات تھی۔ لیکن اس نے تو سرے سے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ پٹن کے سامنے اس وقت یہ سوال تھا کہ اپنی خودداری کی حفاظت کیونکر کی جائے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ہٹاؤ بھی بات کیوں بڑھائی جائے۔ اس نے اس خیال کا فوراً ہی گلا گھونٹ دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ عطائی کو ماں کی گالی دو اور یہاں سے تیر ہو جاؤ۔ لیکن مجمع سے کنارہ کشی بہت بڑا ایثار ہوتی اور پٹن بس ارادہ کر کر کے ہی رہ گیا۔ شیشیاں لے کر بھاگ جانے کا خیال بھی اس کے ذہن میں آیا تھا' لیکن اس میں ایثار کے ساتھ ساتھ دوسرے خطروں کا بھی جھمیلا تھا۔ لیکن خیر پٹن کو میدان عمل میں اُترنے کی زحمت گوارا کرنی نہیں پڑی۔ قدرت نے خود انتظام کر دیا۔ عطائی نے یکا یک اعلان کیا۔

''میرے عزیزو! تم نے دوا تو لے لی، لیکن ایک بات نہ سوچی وہ بات میں تمہیں بتاتا ہوں جس کا دل صاف ہے وہ تو چار منٹ میں چاق و چوبند ہو جائے گا۔ مگر (با آواز بلند) مگر جس کے دل میں کھوٹ ہے اس کے معاملہ کی صفائی کا امتحان لیتا ہوں۔ فرض کرو کہ اس شیشی کی قیمت ایک چونی ہے۔ اب ذرا یوں دیکھوں تو سہی کہ کون کون اس کی قیمت دیتا ہے۔''

امتحان واقعی سخت تھا۔ لیکن امتحان دینے والوں کے جگرے کی بھی تو داد دیجئے، کسی ایک نے چوں نہیں کی اور سوائے تہد والے کے سب ہی نے چپ چپاتے چونی نکال نکال کے دے دی۔ مگر فتور تو تہد والے کی نیت میں بھی نہیں تھا۔ اس کی انٹی میں پیسے تھے ہی نہیں۔ اس نے حسب ہدایت کھلے الفاظ میں اعلان کر دیا کہ

"گھر پہنچتے ہی ماں سے چونی لے کر مسجت کے طاق میں رکھی آؤں گا۔"

باقی سب نے نقد چونی دی۔ حالانکہ اللہ میاں، ہمیشہ صبر کرنے والوں کی کمک پر ہوتے ہیں۔ مگر ان اللہ کے بندوں کو تو بغیر کسی پشت پناہی کے ہی صبر کا امتحان دینا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مرتبہ سب چونیاں یہ کہہ کر واپس کر دی گئی تھیں کہ

"عزیزو ہم نے تو تمہیں آزمایا تھا۔ ہم پیسہ کوڑی کے لوبھی نہیں ہیں۔"

عطائی نے اس آزمائش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے چونیاں واپس لے لی تھیں اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ

"جس فقیر نے لوبھ کیا، اس کی دوا کی تاثیر جاتی رہی۔ قسم اوپر والے کی جس نے ہمیں تمہیں پیدا کیا ہے اور جس کے دم کا یہ سارا ظہور ہے۔ ہم ان چونیوں کو ہاتھ نہ لگائیں گے اور کل تمہارے سامنے اسی مقام پہ غریبوں، فقیروں کو جمع کر کے یہ سارے پیسے انہیں بانٹ دیں گے۔"

پتہ نہیں کہ دوسرے دن غریبوں فقیروں کے مجمع میں وہ چونیاں بٹیں یا نہیں، لیکن اتنا یقین ہے کہ پنن وہاں ضرور پہنچا ہو گا۔ پنن اب حد سے زیادہ آوارہ ہو چلا ہے۔ مجمعے تو شریفوں کے بھی لگتے ہیں مگر پنن تو ہمیشہ عطائیوں، مداریوں، بندر والوں اور ریچھ والوں ہی کے چکر میں گرفتار رہتا ہے۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ گوبر کا کیڑا گوبر ہی میں خوش رہتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ آج چوک میں بڑا شاندار جلسہ ہو رہا ہے۔ پنن جانے کس دھن میں تھا ادھر جا نکلا۔ مگر اس کی آوارہ مزاجی دیکھو وہاں دو منٹ نہ ٹکا۔ حالانکہ اس وقت تقریر پورے عروج پر تھی۔ صدر محترم فرما رہے تھے۔

"لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ اتنے سالوں میں تم نے کیا کیا۔ ہمارا جواب ہے کہ ہم

نے ان تین سالوں میں اپنے ملک کو اپنی جگہ پر قائم رکھا (تالیاں۔ تکبیر کے نعرے) ہم اپنے دشمنوں کو ایک بار پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنی نوزائیدہ مملکت کی سالمیت، وحدت اور آزادی کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے سے دریغ نہیں کریں گے (تالیاں...... تکبیر کے نعرے) مگر ہم جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ اسلام امن پسندی کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایشیا میں جنگ کے شعلے بھڑکیں اور دنیا کا امن خطرے میں پڑ جائے۔ اس لئے ہم خاموش ہیں۔ ہم متوقع اور متمنی ہیں کہ ہمارے دشمن اپنے جارحانہ اقدام سے باز آ جائیں گے۔ بصورت دیگر ہم اپنی علاقائی سالمیت کی حفاظت کی خاطر جوابی اقدامات کریں گے اور اگر اس سے عالمگیر امن معرض خطر میں پڑا تو اس کی ذمہ داری خود ہمارے دشمنوں پر ہو گی۔"

یہ فقرے اتنے جوش اور خلوص سے ادا کئے گئے کہ سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور چوک کی فضا ساڑھے تین منٹ تک اللہ اکبر کے فلک شگاف اور زلزلہ فگن نعروں سے گونجتی رہی۔ اب رہا فرسودگی کا اعتراض تو حضرت صداقت تو اس سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ جب اس بوڑھی کھوسٹ عروس ہزار داماد پہ لوگ صدقے واری ہو سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تین چار سال پرانے نعروں کو دلکش نہ سمجھا جائے اور پھر ہم نے ٹکسال تھوڑا ہی کھول رکھی ہے کہ روز ایک نیا نعرہ گھڑا جائے۔ مگر پنن کو کون سمجھائے، اسے تو عطائیوں سے تریا چلتر کے قصے سننے کا چسکا پڑ گیا ہے اور ہم پوچھتے ہیں کہ عطائی ہی کون سا روز نیا قصہ سناتے ہیں۔ انہوں نے بھی بس ایک دو قصے رٹ رکھے ہیں۔ جن کا انجام وہ کبھی نہیں سناتے۔ بس ان کے بہانے اپنی دوائیاں بیچ جاتے ہیں۔ یہ بھی خوب رہی کہ عطائی کے لئے جو بات ہنر ہے۔ وہ دوسروں کے لئے عیب بن گئی۔

مختصر یہ کہ پنن جلسہ میں سے صاف کھسک آیا۔ حالانکہ اگر نتھیا آلھا پڑھ رہا ہوتا اور وہاندو کی پلٹن کا جادو کے زور سے بندر بننے کا قصہ سنا رہا ہوتا تو پنن وہاں جم کے کھڑا ہو جاتا۔ منٹ دو منٹ گئے ہوں گے کہ ایک بندر والا ادھر سے گزرا تھا۔ نہ معلوم پنن کے کان میں کیسے بھنک پڑ گئی۔ ابھی ابھی وہ اسی کے پیچھے لپکا ہوا گیا ہے۔ مگر عجب بات ہے کہ بندر والا تو سامنے والی گلی میں گیا ہے اور ڈگڈگی کی آواز چوک سے آ رہی ہے۔

☆......☆......☆

اصلاح

اسے صدمہ تو ضرور ہوا لیکن نہ اتنا کہ روگ بن جائے۔ اسے اپنے دل کو سمجھانا بھی آتا تھا۔ پتنگوں کی نیرنگی سے وہ خوب آشنا تھا۔ بعض پتنگیں تننے سے پہلے گزر جاتی ہیں۔ بعض پتنگیں آسمان کو چوم کر ہتھے سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ جو آناً فاناً کٹ جاتی ہیں۔ وہ بھی پتنگیں ہی ہوتی ہیں اور جو ہفتوں تنی رہتی ہیں اور پھر ڈگمگ ڈگمگ کرتی ہوئی کہیں گہرائیوں میں ڈوبتی ہیں وہ بھی پتنگیں ہی ہوتی ہیں۔ انجام بہرصورت سب کا وہی ہے۔ پتنگوں کی دنیا کا افسانہ یونہی چلتا آیا ہے اور یونہی چلتا رہے گا۔ اگر اس کی بھی پتنگ کٹ گئی تو یہ کون سا ایسا انوکھا واقعہ ہوا۔ اس واقعہ کا افسوس ناک پہلو تو صرف اتنا تھا کہ جانے کیا کیا قربانیاں دے کر تو اس نے ایسی کمال کی لگدی کی ترکیب معلوم کی تھی اور جانے کن کن مصیبتوں سے اس نے مانجھا سونتا تھا اور دیکھتے دیکھتے اس کی ساری محنت پہ پانی پھر گیا۔ اگر کنوں کے آس پاس سے پتنگ کٹتی تو خیر کوئی ایسی بات نہ ہوتی لیکن وہ تو ایسی جگہ سے کٹی جہاں اس کے مانجھے کی حدیں ختم ہو کر سادہ ڈور کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔

پتنگ بازی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں۔ یہ فن فرصت اور فرصت سے زیادہ پیسہ چاہتا ہے۔ گلی ڈنڈا ابنا شد کہ ڈیڑھ پیسہ دے کر کسی اناڑی بڑھئی سے گلی چھلوائی۔ ٹوٹی پھوٹی لاٹھی کو کاٹ پیٹ کر ڈنڈا بنایا اور عمر بھر کے لئے نبٹ گئے۔ مانجھے کی بات جانے دیجئے روز کی پتنگوں ہی میں دیوالہ پٹ جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں تو ڈھیلچا پتنگ بھی پیسے کی ملنے لگی تھی اور مانجھے کے ساتھ یہ آفت ہے کہ پیچ لڑائے تو گھسے پڑ جاتے ہیں اور سینت کر رکھئے تو اتر جاتا ہے۔ اگر کہیں ذرا گھٹیا مانجھا ہوا تو تیسرے دن لونی سی اترنے لگتی ہے۔ اسے کلو کی خوش نصیبی کہئے کہ کبھی دمڑی گانٹھ سے خرچ نہیں کی لیکن ہر رنگ کی پتنگ اور ہر کاٹ کا مانجھا گھر میں

موجود رہا۔ یہ سارا فیض اس کے گھر کی چھت کا تھا جہاں ڈور برستی تھی اور پتنگیں نازل ہوتی تھیں۔ کلو کے دادا جان نے شاید پتنگ بازوں کی مورچہ بندیوں کے پورے نقشے کو ذہن میں رکھ کر زمین خریدی تھی اور مکان بنوایا تھا۔ جب شمال مشرق کی ہوا ہوتی تھی تو چوک سے اڑنے والی ساری پتنگوں کی ڈور اس چھت کی زد میں ہوتی تھی۔ ہاں جب ہوا سیدھی مشرق کی طرف چلنے لگتی تھی تو مرکزِ ثقل کلو کی چھت سے مسجد کے گنبدوں پہ منتقل ہو جاتا تھا۔ مگر ہوا سیدھوں سیدھ تو کبھی کبھار ہی چلتی ہے۔ عام طور پر وہ کلو کی خواہش کے مطابق ہی چلتی تھی اور اگر اس کا رُخ سیدھا ہوتا بھی تو نہال کی ڈور تو اس صورت میں بھی اس کے سر پر ہی لہراتی نظر آتی تھی۔ نہال کا کوٹھا کلو کے مکان کے عین عقب میں واقع ہے اگر بیچ میں گلی نہ ہوتی تو دونوں کی حدیں ایک دوسرے سے متصل ہو گئی ہوتیں۔ نہال کی پتنگ بازی مسلم، لیکن کلو کو اس سے بڑی کوفت ہوتی تھی کہ ہفتے گزر جاتے تھے اور نہال کی پتنگ کٹنے کو ہی نہیں کہتی تھی۔ نہال کی ڈور لوٹنے کے لئے انتظار بہت کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مرتبہ جب اس کی پتنگ کٹ جاتی تھی۔ تو اگلے پچھلے سارے حساب بے باق ہو جاتے تھے۔ اول تو یہ کہ ریلیں کی ریلیں خالی ہو جاتی تھیں۔ تب وہ کٹنے کا نام لیتی تھی۔ پھر یہ کہ نہال ڈور کھینچنے کا قائل نہیں تھا۔ ادھر پتنگ کٹی، ادھر اس نے ہاتھ پہ سے ڈور توڑی۔ کلو کے وارے نیارے ہو جاتے تھے، ڈور سمیٹنی مشکل ہو جاتی تھی۔ نہال کی پتنگ کٹنے کا منظر بھی کچھ عجیب سا ہوتا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا جہاز ڈوب رہا ہے۔ اس کا ڈھیاپلچی بڑی شان سے آسمان کی طرف اٹھتا چلا جاتا اور اوپر پہنچ کر کچھ اس انداز سے ساکت ہو جاتا گویا آسمان کا کوئی گہرا راز اس نے دیکھ پایا ہے۔ پھر جب چوک سے کوئی پتنگ اُٹھتی اور اِترا اِترا کے فضا میں فراٹے بھرتی تو اس میں جنبش پیدا ہوتی، اس کے چوڑے چکلے مُڈّے کا رُخ آسمان کی طرف ہو جاتا اور وہ نیچے کی طرف جھکتا چلا جاتا، یہاں تک کہ پتنگ کو جا دبوچتا۔ چند لمحوں کے اختلاط کے بعد پتنگ پگھل جاتی اور وہ فارغ ہو کر پھر بلند ہو جاتا اور اپنے سابقہ مقام پر پہنچ کر مراقبے میں پھر مصروف ہو جاتا۔ چوک سے اُٹھنے والی پتنگوں کے رنگ ہر لحظہ بدلتے تھے۔ ابھی ادھ کٹا ٹھمکتا ہوا اٹھا ہے، ابھی پٹیالا سرسراتا ہوا چلا ہے۔ ذرا آنکھ جھپکی اور پٹیالا غائب، اس کی جگہ چاند تارا موجود تھوڑی دیر میں دیکھئے تو ادھ کٹا رخصت اور اس کی جگہ گلاس چھلک رہا ہے پھر ذرا آنکھیں مل کر نگاہ

ڈالئے تو گلاس لڑھک چکا ہے اور اس کی بجائے پری جلوہ دکھا رہی ہے۔ چوک سے اُبھرنے والے نقش ہمیشہ آنی و فانی ثابت ہوئے، قرار تو بس نہال کے ڈھیاپلچی کو تھا۔ لیکن پھر یوں ہوتا کہ ایک روز یکا یک چوک سے کوئی چوڑی چکلی پتنگ بلند ہوتی، اور ادھر نہال کے ڈھیاپلچی کے قریب آتی اور کنی کاٹ کر نکل جاتی۔ ادھر سے ڈھیاپلچی باز کی تیزی سے جھپٹتا اور وار میں ناکام ہو کے سرسراتا ہوا دوسری سمت میں پہنچ جاتا۔ پھر یکا یک مڈبھیڑ ہوتی اور ڈھیل پہ ڈھیل دی جاتی، نہال کی چرخی ایک خاص رفتار سے آہستہ آہستہ گھومتی، پتنگیں دور ہوتی چلی جاتیں اور فضا کے آر پار چاندی کے دو تار تن جاتے، کبھی کبھی یوں ہوتا کہ ہوا کے بوجھ سے نڈھال ہوتی ہوئی ڈور کلو کے کانوں پہ آٹکتی اور کلو کے سارے جسم میں ایک شیریں سنسنی سی پھیل جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ ہاتھ بڑھا کر توڑ لے۔ لیکن پتنگ بازی کا بھی ایک ضابطہ ہوتا ہے اور اس ضابطے کو توڑنے کی ہمت کلو میں کبھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ آہستہ سے منڈیر کے دوسری طرف سرک جاتا۔ ڈور اور جھکتی اور منڈیر کو چھو لیتی۔ پھر نہال کا ڈھیاپلچی چکر کاٹنے لگتا اور یکا یک ڈور نڈھال ہو کر منڈیر پہ گر پڑتی اور ڈھیاپلچی کچھ اس انداز سے جھوٹنے کھاتا ہوا فضا کی لہروں میں ڈوبتا چلا جاتا گویا کوئی بھاری بھرکم جہاز طوفان کی زد میں آ گیا ہے اور جھکولے کھاتا ہوا غرق ہو رہا ہے۔ اس وقت اڑتی ہوئی ان گنت پتنگوں کے باوجود آسمان خالی خالی نظر آتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ فضاؤں میں روشنی کرنے والا کوئی بڑا قندیل گل ہو گیا ہے اور آسمان پر ایک دم سے اندھیرا چھا گیا ہے۔

پتنگ بازوں کی پتنگیں کٹتی تھیں اور کلو کا کام بنتا تھا۔ کسی کی پتنگ کٹے، اسے تو ڈور لوٹنے سے مطلب تھا اور یہ لوٹنے کا ہی فیض تھا کہ اس کے پاس ایک نہیں بلکہ ستر قسموں کا مانجھا موجود تھا۔ جب وہ پتنگ اڑانے کھڑا ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے اس کی ڈور کی گٹک کا رنگ بدلتا چلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک سرخ مانجھا چلتا، پھر یکا یک صورت بدلتی اور زرد رنگ کی تہیں کھلنے لگتیں، پھر یہ تہیں بھی ختم ہو جاتیں اور ہرے رنگ کا مانجھا شروع ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد انگلیوں کے درمیان میں سے ایک گرہ سرکتی ہوئی محسوس ہوتی اور مانجھے کا رنگ ہرے سے سرمئی ہو جاتا۔ تھوڑی دیر تک گٹک زمین پر پڑی سرمئی رنگ کی جھلک کے ساتھ قلابازیاں کھاتی رہتی اور دیکھتے دیکھتے اس کا رنگ نیلا پڑ جاتا۔ بہت دیر کے بعد مانجھا ختم

ہوتا اور سفید ڈور دکھائی دیتی۔ پہلے تو یہی دھوکہ ہوتا کہ ساری ریل کنھیا مارکہ ڈور کی ہے۔ لیکن پانچ چھ گز ڈور اُتر جانے کے بعد یہ راز کھلتا کہ اس سے نیچے شیر مارکہ ڈور ہے کہتے ہیں کہ شیر مارکہ کی ڈور کے نیچے پھول مارکہ کی ڈور اور پھول مارکہ کی ڈور کے بعد تاش کی ڈور اس گٹک میں چھپی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا پتہ چلانا کچھ ایسا آسان اس لئے نہیں تھا کہ کلو نے پتنگ کو بہت بڑھانا کبھی مناسب نہ سمجھا۔ اس کا پتہ تو اس صورت میں چل سکتا تھا کہ کلو کو جیسی کہ اس کی کوشش تھی کہ کہیں سے ہچکا مل جاتا اور وہ گٹک پر سے ساری ڈور اتار کر ہچکے پہ چڑھاتا۔ لیکن ہچکا اسے کیسے مل سکتا تھا۔ گٹکیں تو خالی پڑی ہوئی مل جاتی ہیں، ہچکے تو یوں نہیں مل جایا کرتے۔ اس کے لئے تو پتنگ بازوں کی ہچکا برداری کرنی پڑتی ہے۔ یہ کام حبیب اور بندا سے خوب آتا تھا۔ حبیب نے پتنگ تو شاید ہی کبھی اڑائی ہو، وہ تو ہچکا تھام کر ہی اپنی تسکین کر لیتا تھا۔ چوک میں وہ ہمیشہ اس تاک میں کھڑا پایا گیا کہ کب مجیدا پتنگ اڑانے آئے اور کب وہ اس کا ہچکا تھامے۔ کلو چوک میں اپنا وقت کیوں گنواتا۔ چوک میں تو ہمیشہ نگھرے لونڈوں کا جمگھٹا رہا۔ جن کی چھتوں کے زاویئے درست ہیں۔ وہ کیوں چوک میں اپنا وقت ضائع کرنے لگے تھے۔ ہچکا نہیں ملا نہ سہی، آخر چھوٹے مکانوں میں بھی لوگ رہتے ہی ہیں۔ کلو نے خالی گٹک پہ ہی قناعت کر لی۔

لیکن لوٹے ہوئے مانجھے کی افراط کے باوجود کلو کو خود مانجھا سوتنے کی اُمنگ ہوئی۔ ہوٹل کا لذیذ کھانا کھانے والوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ گھر کا پکا ہوا سالن کھایا جائے۔ شریف پتنگ والے کی دوکان کی باتیں سن کر اس نے لگدی کا ایک نسخہ بھی معلوم کر لیا تھا۔ لالٹین کی ٹوٹی ہوئی چمنی صحن کے اونچے طاق میں رکھی تھی اور کئی برساتیں اس کے سر سے گزر چکی تھی۔ وہ اتنے غیر محسوس طریقے سے وہاں سے غائب کی گئی کہ کلو کی آپا جی کو بہت دنوں تک یہ خیال ہی نہ آیا کہ یہ طاق کیوں خالی پڑا ہے۔ چاولوں کا تو گھڑا بھرا رکھا تھا۔ مٹھی بھر چاول نکل جانے کا انہیں کیا پتہ چلتا۔ گھی کوار کے پٹھے عیدگاہ والے باغ کے گرد بہتیرے لگ رہے تھے۔ البتہ تج لکڑی اور سمندر جھاگ کے لئے ڈھائی پیسے ضرور خرچ کرنے پڑے۔ خیر ایسے موقعے بھی آتے ہی ہیں جب فضول خرچی وقت کا تقاضا بن جاتی ہے۔ کلو کو شفتالو رنگ زیادہ پسند تھا۔ اس لئے اس نے لگدی میں یہی رنگ ملایا تھا۔ بہرحال جیسے تیسے کر کے اس نے مانجھا سونت

ہی ڈالا اگرچہ اس چکر میں اس کی انگلی بھی کٹ گئی۔

پہلے اس نے انگلیوں سے مانجھے کے بھربھرے پن کو محسوس کیا۔ بار بار اس نے اس کے کھلتے ہوئے رنگ پہ دل ہی دل میں واہ واہ کی پھر وہ اپنی لوٹی ہوئی پری لے کر چھت پہ پہنچا۔ پہلے اس نے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اسے آہستہ آہستہ زمین پر ڈال کر ہوا کا رُخ معلوم کیا۔ اس کے بعد اس نے پتنگ میں مانجھا باندھ کر ایک دو جھٹکے دیئے۔ اس عمل میں اسے خاصی دیر لگ گئی۔ پھر بھی اسے پتنگ تاننے میں زیادہ پریشانی اٹھانی نہیں پڑی۔ جب پتنگ تن گئی تو ایک بار پھر اس کی توجہ مانجھے کی طرف منتقل ہوگئی۔ اس نے بار بار اسے اپنی مٹھی میں بڑی احتیاط سے محسوس کیا۔ پھر مٹھی سے آگے چل کر فضا میں تنے ہوئے مانجھے پہ بھی اس نے آہستہ آہستہ انگلیاں پھیریں اور دل ہی دل میں مانجھے کی نفاست، تیزی اور کھلتے ہوئے رنگ پہ داد دی۔ اس نے تھوڑی ڈھیل اور دی اور اس کی چٹکی میں سے ایک گٹی پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مانجھا ختم ہو چکا تھا اور اب قدرے چکنی اور قدرے میلی ڈور اس کی انگلیوں کو گرما رہی تھی۔ ڈور سے زیادہ وہ اس نرم اور شیریں بوجھ سے لطف اندوز ہو رہا تھا جسے ڈور کی وساطت سے اس کی انگلیاں محسوس کر رہی تھیں۔ ایک بڑے غیر واضح اور مبہم سے انداز میں وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ دور فضا کی بلندیوں میں دو ان دیکھے بازو کھلے ہوئے ہیں جو بڑھ کر پری کو اپنی آغوش میں بھینچ لینا چاہتے ہیں اور پری خود سپردگی کے انداز میں اس کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے۔ اس نے جلدی جلدی پتنگ کھینچی اور پھر ایک ساتھ ڈھیل دے دی اور پری ایک وارفتگی کے عالم میں اس ان دیکھی کھلی ہوئی آغوش کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ڈور کو چٹکی میں تھاما، ایک تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ بازوؤں کی گرفت شدید ہوتی گئی، پری قریب سے قریب تر ہوتی گئی، پھر پری پہ غشی طاری ہوگئی، نڈھال ہو کے نیچے گرنے لگی۔ کلو نے دو تین ٹھمکیاں دیں اور پری پھر بلند ہوتی چلی گئی۔ کلو اس کیفیت میں ایسا غرق ہوا کہ اسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ پیچھے کے کسی کوٹھے سے کس وقت ایک پتنگ اٹھی۔ اس نے تو بس اسے پری پہ گرتے ہوئے دیکھا اور پری کھٹ سے اس کی گرفت میں سے نکل کر نشہ میں جھومتی جھامتی فضا کے بازوؤں کی طرف کھنچتی چلی گئی اور اس مقناطیسی آغوش میں رفتہ رفتہ گھل گئی، گم ہوگئی۔

کلو کا عجب حال ہوا۔ اسے پتنگ کے کٹنے کا صدمہ نہیں تھا۔ وہ تو اپنی بے خبری پہ پیچ و

تاب کھا رہا تھا۔ آخر مانجھا تو اس کا نیا تھا اور بڑا تیز تھا۔ اگر وہ ذرا ہوشیار رہتا تو خوب پیچ لڑتے اور مانجھا اپنا اثر دکھاتا اور پھر دکھاتا، مگر اِک ذرا سی غفلت اسے لے بیٹھی اور اب وہ کٹی ہوئی ڈور ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ شفتالو مانجھے کی یاد دلانے کے لئے دو گز کا ایک ٹکڑا رہ گیا تھا۔ جانے یہ حزن و ملال کی کیفیت اس پہ کب تک طاری رہتی۔ لیکن اس کی نظر اوپر جو اٹھی تو کیا دیکھتا ہے کہ دور سے ایک پتنگ تیرتی چلی جا رہی ہے۔ کلو نے پھریری لی اور اس کا دل پتنگ کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ بہت بلندی پر وہ آہستگی سے ہلکورے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ گویا فضا کے پھیلاؤ اور بلندی نے اس پہ جادو کر دیا ہے اور وہ نیند میں چل رہی ہے۔ اُونگھتی ہلکورے کھاتی وہ اس کے سر سے گزری چلی گئی۔ اس طرف سے نا اُمید ہو کر ایک دفعہ پھر اس نے فضا کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ حیران سا ہوا۔ جانے کیا بات تھی کہ آسمان کچھ خالی خالی سا تھا۔ چوک سے آج کوئی پتنگ نہیں اُڑی تھی۔ ایک آدھ کٹی پتنگ ضرور نظر آ رہی تھی۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کس کوٹھے سے اُٹھی ہے۔ وہ تو فضا میں کچھ معلق سی ہو کے رہ گئی تھی۔ اس سے ذرا پستی میں ایک دھیلچی پتنگ اُڑ رہی تھی۔ کلو کو اچانک خیال آیا کہ ان دونوں پتنگوں میں پیچ لڑیں گے اور ہوا چونکہ ذرا خلاف پڑ رہی ہے۔ اس لئے وہ پھڑٹاپٹا رہ جائے گا۔ یہی ہوا۔ پتنگوں کی نقل و حرکت میں تبدیلی ہوتے دیکھ کر وہ ذرا اور چونکا مگر ابھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ پیچ لڑ گئے اور دھیلچی پتنگ کٹ کر فضا میں جھونٹے کھانے لگی۔ پہلے تو کلو نے یہ امید باندھی تھی کہ وہ اس کی چھت پر آ کے گرے گی مگر جب اس کی رفتار کو اس نے سست پڑتے دیکھا تو وہ تیر کی طرح چلا اور سیڑھیوں سے کودتا پھاندتا نیچے جا پہنچا۔ صحن میں اس کی آپا جی نے اس کی بدحواسی پر نکتہ چینی کی مگر اس نے اس نکتہ چینی اور احتجاج کی طرف سے آنکھیں بند کر ایک چھلانگ لگائی اور دم کے دم میں صحن سے نکل کر دوباری سے گزر، گلی میں جا پہنچا۔

اِدھر وہ گلی سے گزر کر چوک میں پہنچا اور اُدھر پتنگ تیورا کر گری۔ اس وقت چوک خالی پڑا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے پتنگ اٹھائی اور اپنی کامیابی پہ دل ہی دل میں خوش ہوتا گھر کو چلا۔ مگر ابھی وہ چوک کے نکڑ پہ ہی پہنچا ہوگا کہ پکڑا گیا۔ پہلے تو وہ سہم سا گیا پھر اسے کچھ غصہ آیا۔ مگر غصے اور خوف سے زیادہ اس پہ حیرت کا جذبہ غالب تھا۔ جس کی پتنگ کٹے گی وہ جھنجھلائے گا بھی۔ نہال کا سا دل گردہ کوئی کہاں سے لائے کہ پتنگ کٹی اور پتنگ اور ڈور

دونوں سے بے غرض ہو گئے لیکن یہ ڈھیلچی والے کس بوتے پر اکڑتے ہیں۔ کلو نے سوچا یہ ڈھیلچا پتنگ بندا کی ہو سکتی ہے۔ مگر خود بندا آ کر اکڑے تو ایک بات بھی ہے یہ دوسروں کے پھڈے میں پاؤں اڑانے والے کون۔ مگر کیا کلو اور کیا کلو کی منطق اور مولوی صاحب کی منطق کے آگے تو اچھے اچھوں کی منطق دھری رہ جاتی ہے۔ سپاہی کیا کم تھا کہ مسجد سے مولوی صاحب بھی آن وارد ہوئے۔ انہوں نے تو مسلمانوں کے زوال پر وہ وعظ دیا کہ سارا چوک گونج اٹھا۔ کلو کو بڑا تاؤ آیا کہ لو جی بندا کی تو پتنگ کٹی، مجھے سپاہی نے دھر دابا اور مولوی صاحب کے مرچیں لگ رہی ہیں اور یہ اسلام کا سوال کیسے کھڑا ہوا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ اس بات کا وہ حلف اٹھانے کو تیار تھا کہ اس نے پتنگ مسجد کی چھت پر سے نہیں بلکہ چوک میں کھڑے ہو کر لوٹی ہے مگر مولوی صاحب پہ تاؤ آ رہا تھا۔ سپاہی نے تو ڈانٹ ڈپٹ کر کلو کو معاف کر دیا۔ لیکن مولوی صاحب آخر وقت تک اپنا فرض ادا کرتے رہے۔

ہیرا پھیری سے کنارہ کشی کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ ابھی تو اس نے چوری سے بھی توبہ نہیں کی تھی۔ آخر اب اس کی چھت پہ رکھا ہی کیا تھا۔ ایک اس کی چھت پہ ہی کیا منحصر ساری فضا میں خاک اڑتی تھی۔ بہت بلندی پہ نگاہ پہنچی تو دور چیلیں منڈلاتی نظر آ گئیں یا کبھی کوئی بھولا بھٹکا کوا سر پر سے کائیں کرتا گزرا چلا گیا۔ مگر کلو کو چھت پہ پہنچنا ضرور۔ لیکن پیچ لڑیں تو پتنگ کٹے۔ آخر اس نے طے کیا کہ چلو ہٹاؤ ایک پتنگ خریدے ہی جو لیتے ہیں۔ پیسہ ہی تو خرچ ہو گا۔ چنانچہ جب دوسرے دن آپا جی نے شکر قندی کے لئے اسے چونی دی تو اس نے بڑی صفائی سے ایک پیسہ پار کر لیا اور پونے چار آنے کی شکر قندیاں آپا جی کے حوالے کیں۔ یہ پیسہ بھی اس کے کام نہ آیا۔ شریف کی دوکان پہ جب وہ پہنچا تو یہ دیکھ کے ہکا بکا رہ گیا کہ جو دیوار رنگ برنگی پتنگوں اور ہچکوں سے آراستہ رہتی تھی۔ وہ اب ننگی بچی کھڑی ہے۔ بس ایک کتبہ لٹک رہا ہے۔ جس پہ یہ شعر لکھا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو رفتہ رفتہ کلو کا دھیان بٹنے لگا۔ کسی ایک کھیل کا غلام بن کر تو وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ پتنگ بازی کا کوئی ٹھیکہ تو نہیں۔ دنیا میں بہتیرے کھیل ہیں۔

چنانچہ ایک روز اپنی چھت کی منڈیر پر بیٹھا بے معنی طور پر گلی میں جھانک رہا تھا۔ حبیب کو ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھ کر یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال وارد ہوا۔ اس نے چلا کر کہا۔

''ابے حبیب! گلی ڈنڈا کھیلے گا؟''

حبیب جانے کس بات پہ پھنکا ہوا تھا۔ تڑ سے جواب دیا:

''رونے والوں سے نہیں کھیلتا ہوں۔''

مگر جب کلو نے اپنی نئی ببول کی بنی ہوئی گلی کا حوالہ دیا تو وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ لیکن پھر بھی وہ بات نبھانے کی خاطر ایک فقرہ کہہ ہی گیا:

''اچھا بیٹا اگر ہار گیا تو کرموں کو تو نہیں روئے گا؟''

یہ جملہ خاصا سخت تھا لیکن کلو نے اس موقعہ پر بردباری سے کام لینا زیادہ مناسب سمجھا اور جب معاملہ طے ہو گیا تو حبیب نے کہا کہ

''میں بوا کو نمک دے آؤں تو چوک میں چل''

اور یہ کہہ کے اس نے دوڑ لگائی۔ ادھر کلو اپنی ببول کی اُجلی گلی اور سفید براق ڈنڈا لے کر گھر سے نکلا۔ مگر گلی ڈنڈے کو نیاز کی سی چیز سمجھ کر ہاتھ میں لے کر چلنا اسے پسند نہ آیا۔ اس نے گلی زمین پہ ڈالی اور چھوٹتے ہی ٹل لگایا۔ گلی اس بے تکے پن سے اور اتنی اونچی اچھلی کہ اس کا ڈنڈا خالی گھوم کر رہ گیا اور گلی پٹاخ سے زمین پہ آ پڑی۔ اس نے دوسری مرتبہ زاویہ دیکھ کر اور خوب جانچ تول کر ضرب لگائی۔ ٹل تو خیر لگ گیا مگر کچھ اس انداز سے جیسے سیلا ہوا ٹوٹا سرسر کرتا ہے اور پھر ٹھس کر کے ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ تیسرا ٹل خاصا کڑاکے دار ثابت ہوا۔ گلی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی بہت شاندار قسم کا ٹل لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ چوک کے نکڑ پر پہنچ کر کلو نے ایک بھرپور ٹل لگانے کی خواہش شدت سے محسوس کی۔ اس نے سیدھا ہاتھ ہونٹوں کے قریب لے جا کر تین چار مرتبہ تھو تھو کیا اور جب ہتھیلی خوب نم ہو گئی تو اس نے ڈنڈے کو ہاتھ میں لے کر تولا اور پوری قوت سے ٹل لگایا۔ ٹل واقعی بڑا کامیاب رہا۔ اس کے کڑاکے سے پورا چوک گونج اٹھا اور گلی تیر کی طرح فضا میں بلند ہوئی۔ شاید وہ دوسرا ٹل بھی اسی شان سے لگاتا لیکن وہی سرخ پگڑی والی معزز ہستی پھر آن نازل ہوئی اور ایک مرتبہ وہی افسانہ معہ مولوی صاحب کے وعظ کے چوک میں پھر دہرایا گیا۔

گھر میں بیکار پڑے پڑے کلو نے اپنے سارے مقبوضات کا جائزہ لے ڈالا۔ اس کے پاس کانچ کی لہریئے دار گولیاں چھ تھیں۔ سوڈے کی بوتل کی وہ سبز اور میلی گولی جو اسے چوک میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ وہ ان کے علاوہ تھی۔ البتہ کوڑیاں اس کے پاس خاصی تعداد میں تھیں۔ اگر حبیب نے بے ایمانی کر کے اس کی تین کوڑیاں نہ جیت لی ہوتیں تو اب اس کے پاس سترہ کوڑیاں ہوتیں۔ خیر اب بھی چودہ کوڑیاں تو تھیں ہی۔ ان میں کھوسٹ کوڑی جس کی پشت غائب تھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کلو نے اس کانی کوڑی کو محض اس لئے ڈال رکھا تھا کہ اگر کبھی ہارنے کی نوبت آئی تو سب سے پہلے اس کی بازی لگائی جائے گی۔ ان میں جو سب سے بڑی کوڑی تھی۔ اس کی پشت تو جان بوجھ کر توڑی گئی تھی اور اس میں زنگ بھر دیا گیا تھا۔ کلو کو دراصل سرمئی پشت والی ننھی کوڑی سب سے زیادہ پسند تھی۔ اس کا ہلکا سرمئی رنگ جو کناروں پہ پہنچتے پہنچتے سفیدی میں بدل جاتا تھا۔ اس کی چکناہٹ اور سب سے بڑھ کر اس کی دندانے دار خوبصورت دراڑ۔ ان سب خصوصیات کو کلو نے ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار اپنی انگلیوں سے اور اپنے ہونٹوں سے اور اپنی زبان سے محسوس کیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ اور کچھ نہیں ہے تو چوک میں چل کر کوڑیاں ہی کھیلی جائیں۔ لیکن اسے پھر اس لمبی لمبی مونچھوں والے سپاہی کا خیال آ گیا اور وہ سہم کر رہ گیا۔ جب وہ اپنی غلیل کی جھاڑ پونچھ کر رہا تھا تو بندا نے کھلے الفاظ میں دعوت بھی دی تھی کہ

"ابے سالے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بس تو کبوتر کے غلہ مار دیجو پھر میں سلٹ لوں گا"

مگر اب تو وہ اتنا بزدل ہو گیا تھا کہ کسی قسم کی حوصلہ افزائی اس پر اثر ہی نہیں کرتی تھی۔

اپنی چیزوں کا جائزہ لیتے لیتے کلو کی نظر اناروں پہ جا پڑی۔ اس نے محنت سے قصائیوں والی مسجد کی بوسیدہ دیوار کے نیچے کھڑے ہو ہو کر شورا کھرچا۔ پھر جب بن کی لکڑیوں سے لدی ہوئی گاڑی ادھر سے نکلی تو اس نے بڑی صفائی سے چار سنٹیاں گاڑی سے کھینچ لیں۔ انہیں بڑی احتیاط سے جلا کر اس نے کوئلہ تیار کیا۔ بھاگ دوڑ کر کے اس نے تھوڑی سی گندھک بھی جمع کر ہی لی تھی۔ غرض اتنی محنت سے تو بارود تیار ہوا۔ انار پھر بھی نہیں جلا۔ تب اسے حبیب نے بتایا کہ

"سالے، بھتنی کے گھاس کھا گیا ہے، اس شورے سے کام نہیں چلے گا۔ بزار سے قلمی

شورہ لا، اور بیٹا یہ بنسٹی کے کوئلہ کا بارود تو ٹائیں ٹائیں فش کر کے رہ جائے گا، پپیتے کے پیڑ کی لکڑی کا کوئلہ بنا۔"

اس نے پھر یہ جتن بھی کیا تھا۔ خان صاحب کے باغ سے ٹٹول ٹٹال کر وہ پپیتے کے پیڑ کی ایک سوکھی شاخ لے کر آیا۔ مکان کی سب سے اوپر والی چھت پر پہنچ کر اس نے کاغذ جمع کئے اور ان میں لکڑی کو رکھ کر دیا سلائی دکھائی۔ لیکن اس میں سے راکھ نکل کر کوئلہ اتنا سا رہ گیا کہ اس کا دل بجھ گیا۔ خیر اس نے پتھریلی منڈیر پر کوئلہ رکھا، بڑی احتیاط سے پڑیا کھول کر اس میں قلمی شورہ ڈالا، تھوڑی سی گندھک ملائی۔ اس اہتمام سے بارود تیار ہوا۔ چوک سے تین چار چھٹے ہوئے انار جو وہ اٹھا کر لایا تھا ان میں اس نے بارود بھرا۔ کام تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ لیکن سر کی سوئیاں ابھی باقی تھیں۔ یکا یک خیال آیا کہ اناروں کے منہ پر پتنگیا کاغذ چپکانے کے لئے اس نے لئی کا انتظام نہیں کیا ہے۔ لئی کا کام گندھے ہوئے آٹے سے لینا چاہئے لیکن جب وہ نیچے آٹا لینے پہنچا تو سینی میں سوجی کا پھولا ہوا حلوہ دیکھ کر اس کی نیت بگڑ گئی۔

معاملہ نیاز کا تھا۔ اگر کلو چپکے سے حلوہ صاف کر دیتا تو کون پوچھتا۔ حشر کی حشر میں دیکھی جاتی۔ مگر اس کے پھوہڑ پن سے بھانڈا پھوٹ گیا اور آپا جی نے گنے بغیر کئی طمانچے اس کے لگا ڈالے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ کلو کا منہ سرخ ہو گیا۔ اسے اپنے اوپر بھی بہت غصہ آیا کہ اس نے جواب میں آپا جی کے بال کیوں نہیں نوچ لئے۔ آئندہ کے لئے اس نے طے کر لیا کہ اب اگر پھر کبھی ایسا ہوا تو وہ بھی ان کے بال کھسوٹ لے گا۔ مگر جب گلی میں جا کر انار چھوڑنے کا واقعہ یاد آیا تو اس کا سارا غصہ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک بے نام سے خوف اور افسردگی نے لے لی۔ اس واقعہ کا تصور کرتے کرتے اس کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا۔ یہ مولوی صاحب سپاہی کی دُم ہیں یا وہ سپاہی مولوی صاحب کی دُم ہے۔ ادھر وہ کھٹ کھٹ کرتا ہوا جانے کہاں سے آن نازل ہوتا ہے، اس کے فوراً بعد مولوی صاحب چیختے چلاتے مسجد سے نکل آتے ہیں۔ مولوی صاحب اور کلو میں پرانی دشمنی چلی آتی تھی۔ جانے اس کا سبب کیا تھا مگر کلو کو تو لے دے کے بس اتنا یاد ہے کہ وہ ایک مرتبہ کیچڑ سے سنے ہوئے پیر مسجد کے نل پہ دھونے گیا تھا۔ بس اس پر مولوی صاحب نے ساری مسجد سر پر اٹھا لی مگر پہلے تو ان کی چیخ و پکار میں ایک بے چارگی کا احساس جھلکا کرتا تھا۔ لہجے کی تبدیلی اب کچھ دنوں سے

واقع ہوئی تھی۔ کلو نے یہ بات تھوڑی دنوں سے محسوس کرنا شروع کی تھی کہ مولوی صاحب اب دہائی نہیں دیتے، حکم چلاتے ہیں، پہلے ان کا وعظ فریاد ہوتا تھا۔ اب فرمان ہوتا ہے۔

دن گزرتے گئے، دن لمبے ہوتے گئے، دنوں کی شگفتگی اور شادابی زائل ہونے لگی۔ دن جو پہلے دوڑتے تھے رینگنے لگے، پھر دنوں کا تنوع ختم ہوا۔ ہر نیا دن پرانا دن ہوتا تھا اور ہر دوسرا دن پہلے دن کا ہم شکل بن گیا۔ پھر نئے پرانے اور پہلے دوسرے کا امتیاز بھی ختم ہونے لگا۔ وقت ایک بے کیف تکرار بن کر رہ گیا۔ وہی ایک ادھ موا دن تھا جو نڈھال ہو کر مغرب میں ڈوب جاتا تھا اور دوسری صبح کو پھر مرتا گرتا آن وارد ہوتا تھا۔ پھر دن مضمحل ہوتا گیا۔ معدوم ہوتا گیا۔ پھر دن کے وجود کا احساس بھی رخصت ہو گیا۔ مٹیالے غبار کا ایک طول طویل جلوس تھا۔ جو رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ رینگنے کی رفتار دھیمی پڑتی گئی۔ یوں لگنے لگا کہ ایک روز جلوس تھم جائے گا، ساکت وصامت ہو جائے گا اور کائنات کا دم گھٹنے لگے گا اور دنیا ختم ہو جائے گی۔ کلو بے معنی طور پر ریل کھولتا اور پھر چڑھاتا اور جب اس عمل سے اکتا جاتا تو گلی ڈنڈا لے کر صحن میں کھڑا ہوتا اور بڑی احتیاط سے ٹل لگانے شروع کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے ذرا بے احتیاطی برتی تھی۔ تو گلی پانی کے مٹکے میں جا پڑی۔ آپا جی نے اس کے منہ پہ وہ طمانچے رسید کیے کہ اس کی طبیعت ہری ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے چھت پر یہ عمل دہرانا شروع کیا تھا مگر چھت کا معاملہ صحن سے بھی ٹیڑھا تھا۔ ہر وقت یہ ڈبکا لگا رہتا تھا کہ کہیں گلی اُچٹ کر کسی دوسری چھت نہ جا پڑے۔ بے معنی طور پر ٹل لگاتے لگاتے جب وہ اُکتا جاتا تو پھر ریل کی طرف متوجہ ہوتا۔ پتنگ اُڑانے کا سلسلہ اب ختم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کے مانجھے میں گھسے پڑ گئے تھے۔ نیلا مانجھا تو بالکل کھوسٹ ہو گیا تھا۔ جو گیا مانجھے میں بھی پھوسڑے نکل آئے تھے اور اب تو گانٹھوں کے درمیان کے وقفے بھی مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کلو ڈور میں کوئی چھوٹا ٹھیکرا باندھتا اور گلی میں لٹکا دیتا۔ وہ ڈھیل دیتا جاتا، دیتا جاتا، یہاں تک کہ لنگر زمین کو جا چھوتا، پھر اسے کھینچنا شروع کر دیتا اور جب لنگر ہاتھ کے قریب آ جاتا تو پھر تیزی سے ڈھیل چھوڑ دیتا۔ پھر کھینچتا اور پھر ڈھیل دیتا اور آخر وہ حرارت کی ایک ہلکی سی لہر جو لنگر کی ڈور میں تیرتی رہتی تھی، سرد پڑ جاتی اور وہ ڈور لپیٹ لیتا، پھر وہ بغیر کسی مقصد کے فضا میں تکنے لگتا۔ چاروں طرف بھورے بھورے ذرّوں کا ایک اتھاہ سمندر بڑی سست روی سے بہتا نظر آتا۔ دور آسمان کی بلندیوں پر چند سیاہ سائے

تیرتے دکھائی دیتے۔ کبھی کبھی ان میں جنبش پیدا ہوتی۔ تھوڑی دیر بازو متحرک رہتے اور پھر ساکت ہو جاتے۔ پھر کبھی کبھی ایک فاختہ اڑتی ہوئی نہال کے کوٹھے پر جو ایک چھوٹی سی برجی ہے اس پہ آ بیٹھتی......اور اپنی چونچ کو کچھ اس انداز سے اپنی پشت کے پروں میں چھپاتی۔ گویا اب وہ اس بیرنگ دنیا کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گی۔ اکثر اوقات یہاں ایک مردار چیل بھی بیٹھی نظر آتی ہے جو کلو کی دھمکیوں اور اینٹوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائی، خود ہی بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی تو بغیر بازوؤں کو ہلائے اور بغیر چونچ کو جنبش دیئے آہستگی سے فضا کہ لہروں میں اتر جاتی اور کسی نا معلوم سمت میں بہتی چلی جاتی۔ اس تھکا دینے والے منظر سے بیزار ہو کر وہ چھت سے نیچے اترتا اور گلی میں بے معنی طور پر اچھلتا کودتا ہوا چوک میں پہنچتا۔ چوک میں بھی اب کون سی دلکشی باقی رہ گئی تھی۔ دنیا جہان کا کوڑا وہاں جمع ہوتا تھا۔ اس بھان متی کے کنبے میں جانے کہاں کہاں سے چیزیں آ کر شامل ہو گئی تھیں سوکھی ہوئی جوتیوں کی ایڑیاں اور پنجے تو خیر ہر گھورے کا لازمی جز ہوتے ہیں، چینی کی ٹوٹی ہوئی پیالیوں اور کانچ کے ٹکڑوں کی موجودگی بھی سمجھ میں آتی ہے اور جس چوک سے کسی زمانے میں ان گنت پتنگیں اڑی ہوں وہاں پتنگوں کے میلے کچیلے ٹڈوں اور ٹوٹی پھوٹی کمانیوں کی افراط کون سے تعجب کی بات ہے۔ مرغیوں اور بطخوں کے بھد میلے پروں اور سفید کبوتروں کے رنگے ہوئے گلابی اور فیروزی بازوؤں کا ہونا بھی ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ٹین کے پچکے ہوئے زنگ آلود ڈبوں کی موجودگی بھی درست، سرخ دھبوں والے چیتھڑوں گودڑوں کی بہتات بھی جائز، مگر موٹر کا وہ پھٹا ہوا ٹائر کہاں سے آیا جس کی وجہ سے جوتیوں کی ساری ایڑیاں کھسک کر پس منظر میں جا پڑی تھیں۔ چوک کے ایک گوشے میں کوڑے نے بلند ہوتے ہوتے ٹیلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہاں حبیب کی بوا کا سفید کھوسٹ مرغا بالعموم آنکھیں میچے ایک ٹانگ پہ کھڑا یوں نظر آتا گویا ایک ٹانگ کا وظیفہ پڑھ رہا ہے یا کائنات کی بے مقصدیت پہ غور کر رہا ہے اسے دیکھ کر کلو کو ادبدا کر حضرت سلیمان کی وفات کا قصہ یاد آ جاتا۔ اسے لگتا کہ حضرت سلیمان پہاڑ پہ عصا ٹیکے کھڑے ہیں، ان کی روح قبض ہو چکی ہے اور دیمک نے اب عصا کو چاٹا، حضرت سلیمان اب دھڑام سے نیچے گرے۔ کلو کو جب اور کوئی مشغلہ سجھائی نہ دیتا تو وہ چوک کے آثار قدیمہ کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی گہرے زرد رنگ کے شیشے کا کوئی ٹکڑا وہ پا لیتا۔ وہ جھٹ الٹی آنکھ بند کر کے سیدھی آنکھ پہ شیشہ لگا لیتا اور

اسے یوں معلوم ہوتا کہ بہت زور کی آندھی چل رہی ہے اور چوک کی ساری فضا زرد پڑ گئی ہے۔
رفتہ رفتہ اس مشغلے سے اس کا دل بھر جاتا، شیشے کو وہ احتیاط سے جیب میں رکھتا اور اونگھتا ٹہلتا گھر کی طرف چل پڑتا۔ آپا جی کی چخ چخ اور کمروں اور دالان کی گھٹی گھٹی فضا سے گھبرا کر اس کا رُخ پھر چھت کی طرف ہو جاتا سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے ایسا لگتا کہ ان کے آگے کچھ نہیں ہے وہ آخری سیڑھی پہ پہنچ کر قدم اٹھائے گا تو دھڑام سے نیچے گر پڑے گا، گہرائیوں میں اُترتا چلا جائے گا، اُترتا چلا جائے گا، بغیر کسی چیز سے ٹکرائے ہوئے، بغیر کہیں ٹکے ہوئے۔

چھت پر پہنچ کر وہی باسی بے کیف منظر پھر سامنے آ جاتا۔ اگر کوئی بہت بڑی تبدیلی ہوتی۔ تو بس اتنی کہ نہال کی چھت پہ مردار چیل کی بجائے کوئی کھوسٹ بندر اونگھتا نظر آتا، فضا کا اضمحلال رفتہ رفتہ اس کی رگ و پے میں پیوست ہو جاتا۔ وہ منڈیر پہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا اور کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ نہال کا ڈھیا پچی کٹ کر فضا میں جھونٹے کھا رہا ہے۔ یہ ڈھیا پچی ہر جھونٹے کے ساتھ دور ہوتا چلا جاتا، یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ پھر یوں لگتا کہ کوئی بھاری بھرکم جہاز طوفان میں غرق ہو گیا ہے۔ آسمان میں اجالا کرنے والا کوئی بڑا قندیل گل ہو گیا ہے اور آسمانوں پر گھپ اندھیرا چھا گیا ہے۔

رفتہ رفتہ تاریکی میں اجالا پیدا ہونے لگا۔ دراصل تاریکی تو ایک لمحاتی کیفیت کا نام ہے۔ اچانک تبدیلی سے تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے، مگر آنکھیں پھر اپنا کام شروع کر دیتی ہیں اور کیسا ہی گھپ اندھیرا ہو اس سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ آخر ایسی مخلوقات بھی ہیں جو صرف اندھیرے میں دیکھ سکتی ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ چمگادڑ تاروں کی چھاؤں سے مانوس ہو گئی اور انسان نے سورج کی تپتی روشنی سے رابطہ پیدا کر لیا۔ مگر اس حادثے سے ترجیح کا پہلو کہاں نکلتا ہے۔ روشنی تو خود ایک قسم کی تاریکی ہوتی ہے اور تاریکی اپنی جگہ پر خود ایک روشنی ہے۔ جب وہ لمحاتی کیفیت سے گزر گئی تو ایک کلو پہ ہی کیا موقوف ہے، سب کی نگاہوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اندھیرے کے اجالے نے نئی نئی راہیں سجھائیں، نئی نئی منزلوں سے روشناس کرایا۔ وہ پگڈنڈیاں جو روشنی کی تاریکی میں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ اب یکا یک اندھیرے کے نور سے جگمگا اٹھیں۔ جن پُراسرار راستوں پر اجالے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ایکا ایکی تاریکی سے منور ہو گئے۔ شریف کا پتنگوں کا کاروبار تو پہلے ہی ٹھپ ہو چکا تھا،

بیڑی، سگریٹ اور پانوں سے وہ کچھ پیسے پیٹ لیتا تھا لیکن اس اسراف کو بھی آخر کب تک برداشت کیا جاتا۔ طے یہ ہوا کہ لوگ اسراف بے جا سے باز آئیں اور سگریٹ بیڑی پینے والے سگریٹ بیڑی کا خرچ اور پان کھانے والے پانوں کے دام قومی یتیم خانے کے چندے میں دیں۔ آخر ایک روز شریف کی دوکان میں تالا پڑ گیا۔ بہت دن تک تو اس کی خیر خبر ہی نہ ملی، لیکن ابھی چند دن ہوئے وہ ایک کوٹھی سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے پیچھے سفید میلے برقعوں میں دو عورتیں بھی تھیں۔ مجیدا بتاتا ہے کہ شریف کا کام اب چل نکلا ہے۔ مجیدا کسی ورکشاپ میں کام کرنے لگا ہے۔ ایک ہڑتال کے چکر میں وہ لیڈر بن بیٹھا۔ پتنگ کے پیچ تو وہ کبھی طریقے سے لڑا نہیں سکا۔ لیکن مزدوروں کے مسائل خوب سمجھتا ہے۔

نہال کا کوٹھا بدستور ویران ہے، وہاں خاک مٹی خاصی تعداد میں جمع ہو گئی ہے۔ مگر ہوا نے اس میں بھی ایک قرینہ پیدا کر دیا ہے۔ کوڑا کرکٹ تو منڈیر کے نیچے کناروں پہ جمع رہتا ہے۔ باقی سطح پر تو گرد کا ایک باریک غلاف چڑھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی غصیارا بگولا سارا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر تیزی سے چکر کاٹتا ہوا اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے۔ شاید اس عزم کے ساتھ کہ اس سب کو آسمان کے منہ پر دے مارے۔ مگر تھوڑی ہی بلندی پہ جا کے اس کا سارا دم خم ٹوٹ جاتا ہے اور سارا کوڑا پھر نہال کے کوٹھے پہ ہی آ پڑتا ہے۔ جس برجی پہ مردار چیل بیٹھا کرتی تھی اسے بندروں نے توڑ پھوڑ کے ختم کر دیا ہے اس سے ذرا ہٹ کر سیاہ منڈیر پر سفید بیٹوں کا ایک بڑا سا دھبہ نظر آتا ہے جس سے چیل کے نقل مکانی کا پتہ چلتا ہے۔ نہال کہیں باہر نہیں گیا ہے، یہیں بستی کے کنارے اس نے دو نئی عمارتیں کھڑی کر لی ہیں۔ دراصل وہ اس قومی یتیم خانے کا مینیجر ہو گیا ہے جو سگریٹ بیڑی اور پانوں کی بچت سے تعمیر ہوا تھا۔ چوک کی زمین بے والی وارث پڑی تھی۔ یہاں اب یتیم خانہ بن گیا ہے اور چوک حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ بندا کی بیوہ اماں، نے بندا کو اسی یتیم خانے میں داخل کرا دیا تھا۔ حبیب کے ساتھ اس کا یارانہ بہت بڑھ گیا ہے۔ کلو ایک عجیب بات کہتا ہے اور قسمیں کھا کھا کر کہ جب وہ عید گاہ کے پیچھے والی بیریوں سے بیر کھا کر نکل رہے تھے تو اس نے بندا کے سیدھے گال پر ایک سرخ نشان دیکھا۔ کلو کی عادت اب بہت بدل گئی ہے۔ کھیل کود سے اسے اب دلچسپی نہیں رہی۔ حبیب اور بندا کی صحبت سے بھی کترانے لگا ہے۔ مگر حبیب نے جو اس کے متعلق الٹی

سیدھی باتیں اڑا رکھی ہیں۔ ان میں سچائی نظر نہیں آتی۔ اس کی تنہا پسندی کچھ نئی تو ہے نہیں۔ پتنگوں کے دنوں میں وہ گھنٹوں اکیلا کھڑا رہتا تھا۔ ڈور اس نے ہمیشہ اکیلے میں لوٹی کبھی کسی لونڈے کو اپنی چھت پہ قدم نہ رکھنے دیا اور چھت ہو یا غسل خانہ، اکیلا ہر جگہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔ حبیب تو کلو سے پہلے ہی گھٹتا تھا۔ وہ کھیل میں ہمیشہ کلو کو رونے اور بے ایمانی کا طعنہ دیا کرتا تھا، حالانکہ حبیب نے ایک مرتبہ خود بے ایمانی کر کے کلو کی تین کوڑیاں جیت لی تھیں۔ گویا حبیب کی بات کو تو بقول کلو گدھے کی لات ہی سمجھنا چاہئے۔ کم از کم مولوی صاحب کی رائے تو کلو کے بارے میں بہت اچھی ہوگئی ہے۔ پرسوں وہ اس کے والد سے کہہ رہے تھے کہ ''آپ کا لڑکا اب بہت سنبھل گیا ہے۔ لعولہب سے وہ بہت احتراز برتنے لگا ہے۔ آپ اس پر اب ذرا نماز کی تاکید شروع کر دیں۔''

☆......☆......☆

محل والے

بڑی بھابی یہی کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے جج صاحب کی تصویر صندوق میں رکھی تھی۔ نہ معلوم یہ بڑی بھابی کی بھول تھی یا راستے میں کوئی واردات گذری، بہر حال جب پاکستان آ کر سامان کھولا گیا تو جج صاحب کی تصویر غائب تھی۔ جج صاحب کی تصویر کے ساتھ تو یہ سانحہ گذرا اور محل کو اٹھا کر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ محل کی دیواریں اب خستہ ہوگئی تھیں۔ مدتوں سے قلعی نہیں ہوئی تھی۔ چھتوں پر گھاس اُگ آئی تھی۔ لیکن دیواروں کی بلندی، بڑا پھاٹک، اونچی ڈیوڑھی یہ سب اس بات کی دلیلیں تھیں کہ محل معمولی عمارت نہیں تھی اور اس کے رہنے والے ایسے ویسے نہیں تھے۔ جج صاحب کا زمانہ اس گھرانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ سارا خاندان ایک جگہ جمع تھا اور محل میں یہ حالت تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لیکن جج صاحب کے گذرنے کے ساتھ ساتھ امی جی کا یہ دور بھی گزر گیا۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی خاندان کا بھرم کسی ایک شخصیت کی وجہ سے بنا رہتا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی ساکھ ایسی بگڑتی ہے کہ بننے میں پھر آتی ہی نہیں۔ محل والوں کے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا۔ جج صاحب نے اپنی زندگی میں خاندان والوں کو ایسا جما کے رکھا تھا کہ نہ تو کسی پہ مفلسی کا دور آیا اور نہ آپس میں کوئی تفرقہ پیدا ہوا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی سارا خاندان تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ جائداد کے بٹوارے تک کی نوبت آ گئی تھی۔ مگر خیر یہ معاملہ تو رفع دفع ہوگیا، ہاں وہ جھمگٹا قائم نہ رہ سکا۔ روزی کی فکر میں جدھر جس کے سینگ سمائے نکل گیا اور جس دیس کی ہوا موافق نظر آئی وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ جبار شیخ نے کلکتہ جا کر بیوپار شروع کر دیا۔ ہادی بھائی آگرہ جا کر پہلے ایک چمڑا رنگنے کے کارخانے میں ملازم ہو گئے۔ پھر اپنی جوتوں کی دوکان کھول لی اور ہادی بھائی جوتے والے کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جعفری اور پروفیسر شاہ نے انگریزی تعلیم پائی تھی۔ انہوں نے تجارت

کے کاموں میں پڑنے میں اپنی ہتک سمجھی۔ جج صاحب مرحوم کے روابط کام آئے اور رنجر جعفری سفارشوں کے زور پر سی۔ پی کے محکمہ جنگلات میں رینج آفیسر مقرر ہو گئے۔ سی۔ پی کے معصوم لوگوں نے نہ معلوم ان میں کیا لٹک دیکھی کہ انہیں سید سمجھ بیٹھے۔ سفارشوں سے حاصل کیا ہوا عہدہ اور سی۔ پی کے عقیدت مند لوگوں کی بخشی ہوئی سیادت، دونوں کے گھال میل سے رنجر جعفری کا نام ظہور میں آیا اور اصلی نام پر غلبہ پایا۔ پروفیسر شاہ پنجاب آ کر شاہ بنے۔ تعلیم نے ان کے مزاج کو ذرا زیادہ خراب کیا تھا۔ انہوں نے جج صاحب کے تعلقات سے فائدہ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا اور اپنی قابلیت کی سفارش پر پنجاب کے معمولی سے شہر کے ایک کالج میں لیکچرار بن گئے۔ نام کے آگے حسین لگا ہوا تھا۔ محلہ والوں نے شاہ صاحب کہنا شروع کر دیا۔ یوں وہ پروفیسر شاہ بن گئے۔ پنجاب کے ایک کھاتے پیتے سید خاندان نے انہیں اپنی غلامی میں لے لیا اور یوں ان کی سیادت پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔ خاندان والوں کو جب یہ خبر ملی کہ خاندان کے دو افراد پردیس جا کر سید بن گئے ہیں تو تھوڑے دن تک خاصا تفریح کا سامان رہا۔ طنزاً انہوں نے بھی ان نئے سیدوں کو رنجر جعفری اور پروفیسر شاہ کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ طنز کا وہ پہلو تو زائل ہو گیا اور رنجر جعفری کو سچ مچ جعفری سمجھ لیا گیا اور پروفیسر شاہ کی بیوی تو خیر تھیں ہی سیدانی۔ اس لئے وہ سیدانی آپا کہلائیں تو بجا کہلائیں۔

مختصر یہ کہ خاندان ہر طریق سے تتر بتر ہوا۔ کوئی شیخ بنا، کوئی سید، کوئی پٹھان۔ کوئی کسی دیس پہنچا۔ کسی نے کسی شہر کا رخ کیا۔ ڈیوڑھی خالی پڑی رہتی تھی۔ محل بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ چھوٹے میاں وضعدار نکلے اور خاندان کے جتنے افراد رہ گئے تھے۔ ان کے سرپرست بن گئے۔ واقعہ یوں ہے کہ جج صاحب کے بعد خاندان میں سب سے بڑے چھوٹے میاں تھے۔ اور جج صاحب کے روپے پیسے کے بھی اصلی وارث وہی تھے۔ باقی تو کوئی پھوپھی کا بیٹا تھا، کوئی چچا کا، کوئی تایا کا، دراصل یہ خاندان کچھ اتنا پھیلا ہوا تھا کہ ان کے باہمی رشتوں کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ بس سب کو ایک احساس سا تھا کہ ہم سب ایک خاندان ہیں۔ خاندان کے تتر بتر ہو جانے کی وجہ سے یہ احساس کچھ اور مبہم ہو گیا تھا۔ اب تو صرف کاج ہی کے موقعہ پر خاندان کے سارے افراد کے نام یاد آتے تھے اور اس قسم کے ہر موقعہ پر اچھی خاصی بدمزگی ہو جاتی تھی۔ ہادی بھائی جوتے والے کی لڑکی آمنہ کی جب بسم اللہ ہوئی تھی تو رنجر جعفری کو دعوت

کا رقعہ نہیں پہنچا جس پہ رنجر نے شکایتوں کے طومار باندھے۔ ہادی بھائی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ انہوں نے ایک خط آگرہ ڈالا تھا اور دوسرا خط محل پہنچ کر بھیجا۔ دراصل اس میں خطا رنجر جعفری کے پتے کی تھی۔ روز تو ان کا تبادلہ ہوتا تھا اور پھر سی۔ پی کے عوج بنونق شہر...... دموہ...... چھندواڑہ...... یوت مال...... پتھریا...... ہردہ...... ذرا ہجے غلط ہو جائیں تو شہر بدل جاتا ہے۔ خیر رنجر جعفری کو رشتوں ناتوں کا احساس تو تھا۔ جبار شیخ تو کلکتہ جا کر ایسے بیگانہ ہوئے تھے کہ تقریب میں شرکت تو درکنار، مبارکبادی کا خط بھی بھیجا بھیجا نہ بھیجا نہ بھیجا۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ساتھ محل والوں کی تاریخ میں ایک انقلاب آیا۔ ہجرت نے بہت سے خاندانوں کا شیرازہ بکھیر دیا مگر محل والوں کے ساتھ معاملہ الٹا ہوا۔ پاکستان نے ان کے خاندان کو پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اگرچہ ان کا محل متروکہ جائداد قرار دے دیا گیا۔ یہ بے محل کے محل والے عجب انداز سے آ کر پاکستان میں آ کر ملے۔ پروفیسر شاہ دوپہر کو کالج سے نکل رہے تھے۔ گیٹ پہ ایک شخص ملا، کپڑے میلے چیکٹ، بالوں میں دھول، بڑھی ہوئی حجامت، پروفیسر شاہ پہلے تو سمجھے نہیں کہ وہ شخص کیوں ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن ایک ساتھ پہچان گئے اور ہادی بھائی کہہ کے گلے سے لپٹ گئے۔ ذرا ہوش آیا تو پوچھنے لگے۔

''بھابی کہاں ہیں؟''

ہادی بھائی روتی آواز میں بولے:

''بھیا میں اکیلا آگرہ سے آ رہا ہوں۔ دکان میں آگ لگ گئی، سینکڑوں کا مال منٹوں میں خاک ہو گیا۔ تمہاری بھابی کو بچوں سمیت میں نے پہلے ہی آگرے سے گھر بھیج دیا تھا۔ جانے کس حال میں ہیں۔''

کوئی تیسرے چوتھے دن جوتے والی بھابی اور باقی سارے محل والے اسپیشل سے آ پہنچے۔ چھوٹے ابا اور بڑی بھابی ہوائی جہاز سے آئیں۔ جبار شیخ بھی کلکتہ سے ہوائی جہاز میں بیٹھے اور پاکستان آن اترے۔ رنجر جعفری دموہ سے بمبئی پہنچے۔ وہاں پندرہ دن تک ساحل پہ مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ خدا خدا کر کے جہاز چلا۔ بمبئی سے کراچی اور کراچی سے پروفیسر شاہ کے گھر۔

عتیق کالج سے آیا تو دیکھا کہ گھر بھرا ہوا ہے، بہت حیران ہوا۔ بڑی بھابی نے اسے آنکھیں مچکا مچکا کر غور سے دیکھا۔ پروفیسر شاہ بولے۔

''عتیق بڑی بھابی آئی ہیں۔''

عتیق نے جلدی سے گھبرا کر سلام کیا اور بڑی بھابی نے اسے اٹھ کے سینے سے لگا لیا۔

''اے ہے عتیق ہے۔ میں نے تو بالکل نہیں پہچانا۔ ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔''

''سیدانی اب اس کی شادی کر دو۔''

جوتے والی بھابی نے بھی اٹھ کر چٹ چٹ بلائیں لیں اور ٹکڑا لگایا:

''ہاں سیدانی تو بس اس کا بیاہ کر ڈالو۔ ہمیں بھی پلاؤ کا نوالہ مل جاوے گا۔''

سیدانی نے بڑی نرمی سے جواب دیا:

''ہاں بڑی بھابی آگئی ہیں۔ اب یہی اس کی شادی کریں گی۔''

اور پھر عتیق سے مخاطب ہوئیں:

''عتیق ! سن رہے ہو۔ بڑی بھابی تمہاری شادی کرنے آئی ہیں۔ بس پڑھنا لکھنا ہو چکا۔ اب امتحان دے کر نوکری کر لو۔''

جب جبار شیخ آ کر اترے رضیہ کو بھی سب سے پہلے بڑی بھابی ہی نے سینے سے لگایا۔ رضیہ کی بڑی بڑی آنکھوں، بھرے بھرے سینے اور بنگالی ساڑھی سے بڑی بھابی بہت متاثر ہوئیں۔

''میری بیٹی بالکل بنگالن سی لگے ہے۔''

پھر جبار شیخ کی بیوی سے مخاطب ہوئیں۔

''اجی اس کی عمر کیا ہے؟''

جبار شیخ کی بیوی بولیں۔

''بڑی بھابی مجھے تو ایسا دھیان پڑے ہے کہ سولھویں برس میں ہے۔''

''بی بی تمہاری مت ماری گئی ہے۔''

بڑی بھابی بگڑ کے بولیں۔

''زیادہ عمر بتانا بھی فیشن ہو گیا۔ رنجر جعفری کے بیاہ میں جب تو آئی تھی تو اللہ رکھے یہ تیرے پیٹ میں تھی۔ رنجر کے بیاہ کو سولہ برس ابھی کہاں سے ہو گئے۔''

جبار شیخ کی بیوی عاجزی سے بولیں۔

''اجی مجھے تو عمروں کا پتہ نہیں ہے۔ تم ہی جانو۔''

بڑی بھابی فاتحانہ احساس کے ساتھ بولیں۔

''ہاں ہمیں پتہ ہے بی بی۔ رنجر کے بیاہ کو پچھلے مہینے پندرہ برس ہوئے ہیں۔ مجھے تو آج کی سی بات یاد ہے۔ اس وقت تجھے ساتواں مہینہ تھا۔ تو میرے حساب سے تو تیزی کے مہینے میں رضیہ سولھویں میں پڑے گی۔''

جبار شیخ کی بیوی نے جوتے والی بھابی سے خطاب کیا'

''اور بھابی آپ کی آمنہ کی عمر کیا ہے؟''

جوتے والی بھابی نے دوٹوک جواب دیا:

''خالی کا چاند دیکھے پہ اٹھارویں میں پڑے گی۔''

آمنہ کی عمر کے سلسلہ میں بڑی بھابی کو اعتراض کی مطلق گنجائش نظر نہ آئی۔ جوتے والی بھابی کو آمنہ کی بڑھتی ہوئی عمر کا اذیت ناک حد تک احساس تھا۔ انہوں نے سالگرہ کے کلاوے کی گانٹھیں احتیاط سے گن رکھی تھیں اور دنوں تک عمر کا حساب لگا رکھا تھا۔

جبار شیخ کی بیوی نے کلکتہ جا کر ساڑھی باندھنی شروع کر دی تھی۔ محض ساڑھی کی مناسبت سے محل والوں نے انہیں ''بنگالن آپا'' کا خطاب دیا تھا۔ بنگالن آپا نے اسے اپنی سج دھج کی شان میں خراج سمجھا اور واقعی اپنے آپ کو بنگالن سمجھنے لگیں۔ رضیہ کی بنگالیت کا احساس سب سے زیادہ عتیق کو ہوا۔ تیسرے پہر کو جب وہ غسل خانے سے اپنی لمبی لمبی لٹیں چھٹکاتی نکلی اور بھرے بھرے سینے سے سرکتے ہوئے ساڑھی کے پلو کو قدرے بے اعتنائی سے درست کیا تو عتیق کو کانن بالا کی فلمیں اور بنگال کے متعلق لکھے ہوئے کئی اردو افسانے یاد آ گئے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ بڑھ کر اس کے چاکلیٹی رنگ کے نرم شانوں کو چھو لے اور کولھوں کو چھوتے ہوئے بالوں میں انگلیاں ڈال کر اس سے اردو افسانوں کی زبان میں محبت کی باتیں کرنے لگے۔ لیکن چھوٹی بھابی سامنے چارپائی پہ بیٹھی چھالیاں کتر رہی تھیں۔ عتیق کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

پروفیسر شاہ کا مکان مختصر تھا لیکن اگر وہ مکان بڑا بھی ہوتا تو کون سا فرق پڑ جاتا۔ محل والے فوج کی فوج تھے۔ کوئی محل سا مکان ہوتا، اس میں ہی سما سکتے تھے۔ اس گھر میں حالت یہ

تھی کہ مکان اوپر تھا لوگ نیچے۔ اسے اتفاق سمجھئے کہ اس محلہ میں برابر ہی ایک سکھ سوداگر کا سہ منزلہ مکان خالی پڑا تھا۔ محل والوں نے موقعہ غنیمت سمجھا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ بالائی منزل کے دو کمرے ہادی بھائی نے قبھائے۔ جوتے والی بھابی نے سنگھار میز اور قالین اٹھا کر سامان کی کوٹھری میں بند کر دیئے کہ آمنہ کے جہیز میں کام آئیں گے۔ فرش پر بچھی ہوئی دری کے انہوں نے چار ٹکڑے کیئے۔ تین بانوں سے بنی چار پائیوں پر بچھائے جو ہادی بھائی جیسے تیسے کر کے خرید لائے تھے، چوتھا ٹکڑا پردے کی نیت سے چوبارے پر لٹکا دیا گیا۔ کتابوں کے متعلق وہ ابھی فیصلہ نہ کر پائی تھیں کہ ہادی بھائی کے ہاتھ مصوری کی ایک کتاب پڑ گئی اور صفحہ ایسی جگہ سے کھلا جہاں ایک برہنہ عورت کی پشت دکھائی گئی تھی۔ ہادی بھائی نے سکھوں کے اس اخلاقی زوال پر ان کی جی بھر کے مذمت کی اور ساری کتابیں باورچی خانے میں ڈلوا دی گئیں تا کہ تھوڑے دن کے لئے ایندھن کی فکر سے فرصت ہو جائے۔

محل والے اپنی جمع پونجی تھوڑی بہت لے ہی آئے تھے۔ لیکن وہ قارون کا خزانہ تو تھا نہیں اور محض خرچ سے تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ جبار شیخ نے کراچی جا کر کاروبار شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر بڑی بھابی نے فوراً مخالفت کی۔ ''نا بھیا ہم تمہیں اکیلا کراچی نہ جانے دیں گے۔''

چھوٹے میاں ہمیشہ بڑی بھابی کے اشاروں پر چلے۔ انہوں نے بھی مخالفت کی۔ ''بھئی اگر سب نے یہی کیا تو سارا خاندان بکھر جائے گا۔ کوئی ایسا بندوبست کرو کہ محل والے سب ایک جگہ بس جائیں'' جبار شیخ کی سمجھ میں بات آ گئی، کراچی کا ارادہ ملتوی ہو گیا۔ یہ خبر ہادی بھائی لائے تھے کہ امپرومنٹ ٹرسٹ کی اسکیم کے ماتحت مہاجروں کو رعائتی داموں پر پلاٹ فروخت ہو رہے ہیں۔ رنجر جعفری، جبار شیخ اور چھوٹے میاں تینوں کو یہ بات بھا گئی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر محل والے مل جل کر کوئی بڑا سا پلاٹ خرید لیں تو سب ایک ہی جگہ آباد ہو سکتے ہیں۔ خاندان کے افراد کافی تھے اور اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر آئے تھے۔ حساب لگا کر تین ایکڑ زمین کی درخواست دی گئی۔ جبار شیخ جب درخواست دینے گئے تو دفتر میں مہاجروں کا وہ ہجوم تھا کہ ایک پہ ایک گرتا تھا۔ اس ہجوم کو دیکھ کر وہ کچھ مایوس سے ہو گئے اور گھر آ کر چھوٹے میاں سے بولے۔ ''اجی وہاں تو خلقت ٹوٹ رہی ہے۔ زمین ملنی مشکل ہی نظر آتی

ہے۔'' بڑی بھابی نے یہ سنتے ہی فوراً پروفیسر شاہ کو بلا بھیجا اور بولیں۔ ''بھیا! ہم کب تک بے گھر بے در پڑے رہیں۔ کوئی بندوبست کرو، سنیں ہیں کہ زمینوں کے حصے بک رہے ہیں۔''

سیدانی آپا بولیں۔ ''اجی بڑی بھابی یہ کیا کریں گے۔ بلی کا گو ہیں، لیپنے میں نہ پوتنے میں ہر وقت کتابوں میں پٹے پڑے رہتے ہیں۔''

چھوٹے میاں بولے۔ ''بھائی اب یاں تو ہم تمہارے رحم و کرم پہ ہیں۔ یاں ہمیں کون جانتا ہے۔ تم ہی کچھ کرو گے۔ خاندان والے سب ایک جگہ رہیں تو اچھا ہے۔ ہمارا کیا ہے ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ بس یہی دعا ہے کہ مٹی عزیز ہو جائے۔ خاندان بکھر گیا تو اس پردیس میں کندھا دینے کے لئے بھی چار آدمی نہ ملیں گے۔''

سیدانی آپا نے پروفیسر شاہ کے متعلق ٹھیک ہی کہا تھا مگر بڑے بھائی کی تقریر کچھ اثر کر گئی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اپنے تعلقات کو کام میں لائے۔ افسروں سے ملے، محل والوں کی جائداد کا حساب بتایا، مسلم لیگ کی جو خدمات کی تھیں وہ جتائیں۔ افسروں کو حق جائز نظر آیا اور انہوں نے یقین دلایا کہ زمین ضرور مل جائے گی اور تین ایکڑ ہی ملے گی۔ پروفیسر شاہ نے جب گھر آ کر یہ ذکر کیا تو بڑی بھابی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رو رو کے کہنے لگیں۔ ''بھیا تم نہ ہوتے تو ہم کیا کرتے۔ پاکستان میں آ کے تو لوگوں کے ایسے خون سفید ہو گئے ہیں کہ کوئی مر جائے منہ میں پانی بھی نہ ڈالیں۔''

جوتے والی بھابی نے گود پھیلا کے دعا دی۔ ''الٰہی پروفیسر کے عہدے میں ترقی ہو۔ پروفیسر اور سیدانی آپا اپنے بیٹے کی بہاریں دیکھیں۔''

دعاؤں کا دور ختم ہوا تو خوابوں کا دور شروع ہو گیا۔ بڑی بھابی کا خیال تھا کہ محل جیسی حویلی بنوالیں گے۔ سیدانی آپا نے ان کی تجویز پسند نہ کی اور خیال ظاہر کیا کہ الگ الگ کوٹھیاں بنی چاہئیں۔ جبار شیخ کی تجویز تھی کہ بہت سے فلیٹ بنائے جائیں۔ چند فلیٹ اپنے قبضے میں رکھے جائیں اور باقیوں کو کرائے پر اٹھا دیا جائے۔ جبار شیخ نے انہیں دنوں اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی کہ مردان میں ایشیا کی سب سے بڑی شوگر فیکٹری قائم ہوئی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پلاٹ کے ایک کونے میں وہ اسی پیمانے پر سوتی کپڑے کا ایک کارخانہ قائم کرنے کا ایک منصوبہ بنا رہے تھے۔ ہادی بھائی کا تخیل جس نے تاج محل کے

سائے میں پرورش پائی تھی سب پر بازی لے گیا۔ ایشیا کا نام انہوں نے پاکستان آکر سنا تھا۔ وہ یہ تو نہ سمجھے کہ یہ کسی سلطنت کا نام ہے یا مسلمان قوم کا لقب ہے۔ مگر چونکہ نظیرا کبر آبادی کے وطن میں پلے تھے۔ اس لئے کان لفظوں کی موسیقی سے آشنا تھے۔ شین کی آواز سے 'ایشیا' کے لفظ میں جو ایک موسیقی پیدا ہوگئی ہے وہ انہیں بھلی لگی اور ایک روز ترنگ میں آکر اعلان کیا کہ ''پلاٹ مل جائے تو ہم وہاں ایشیا کا سب سے بڑا زری جوتوں کا کارخانہ کھولیں گے۔''

جوتوں والی بھابی نے انہیں فوراً آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تمہاری ایشیا ویشیا کے سر میں بھوبل پاکستان آکے تمہیں یہ باتیں سوجھی ہیں۔''

محل والوں کی قسمت نے زور مارا۔ تین ایکڑ کا پلاٹ الاٹ ہوگیا۔ پلاٹ ملنے کے ساتھ خوابوں کا دور ختم اور منصوبہ بندی کا دور شروع ہوا۔ چھوٹے میاں نے کئی نقشے بنائے لیکن ہر نقشے میں کوئی نہ کوئی نقص نکل آیا۔ پہلے نقشے میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ رہائش کے لئے چند کوٹھیاں تعمیر ہوں اور باقی کرائے پر اٹھانے کے لئے فلیٹ بنوائے جائیں۔ اس تجویز کے مطابق دوسرا نقشہ تیار کیا گیا۔ اس پر پروفیسر شاہ کو اعتراض تھا کہ کوارٹر بہت تنگ ہیں، کمرے ہوادار نہیں، صحت پر برا اثر پڑے گا۔ یوں یہ نقشہ بھی رد ہوگیا۔ چھوٹے میاں نے شروع میں بڑی سرگرمی سے کام شروع کیا تھا۔ دو نقشوں کی تنسیخ کے بعد فوراً تیسرا نقشہ پیش کیا۔ اس مرتبہ ہادی بھائی نے اڑتی پتنگ میں لنگر مارا۔ ''چھوٹے میاں آپ نے تو سارے فلیٹ بنا دیئے ہیں۔ کچھ دوکانوں کی بھی گنجائش نکالئے۔'' بات معقول تھی، چھوٹے میاں کو جھکنا پڑا، انہوں نے نقشہ میز کی دراز میں ڈال دیا اور دوسرے کاموں میں لگ گئے۔

جبار شیخ اور ہادی بھائی کو آخر بیکلی شروع ہوئی۔ ان کی بیکلی نے دوسروں کو بھی متاثر کیا۔ آخر چھوٹے میاں سے تقاضے شروع کئے۔ چھوٹے میاں نے تنگ آکر پھر نیا نقشہ تیار کیا۔ رنجر جعفری نے چلتی گاڑی میں پچر لگا دی۔ ''چھوٹے میاں! آپ اتنی بڑی بستی تعمیر کر رہے ہیں اور درخت ایک بھی نہیں۔ بڑی بھابی نے سنا تو وہ بولیں۔ ''اجی نیم کے پیڑ تو ضرور ہونے چاہئیں۔ پاکستان میں برساتوں پہ برساتیں گزری جا رہی ہیں اور جھولے کی صورت نہیں دیکھی۔''

سیدانی آپا نے نیم کی حمایت اس وجہ سے کی کہ اس کے سائے میں وہ تنور بنا سکیں گی۔ بڑی بھابی کا خیال تھا کہ آم جامن کے درخت بھی ہونے چاہئیں اور تھوڑی سی پھلواری بھی۔

چھوٹے میاں نے الکساہٹ سے نقشہ لیا اور آتشدان پہ رکھ دیا۔ نقشے پہ اتنا گرما گرمی سے بحث ہوئی تھی کہ ایک ڈیڑھ مہینے تک تو تھکن کا سا احساس رہا اور کسی نے پھر اس کا ذکر ہی نہیں چھیڑا۔ لیکن جب دو مہینے ختم ہوگئے اور چھوٹے میاں کروٹ لیتے نظر نہ آئے تو پھر کھدبد شروع ہوئی۔ دن گزرتے گئے اور چھوٹے میاں خاموش تھے۔ پہلے سرگوشیاں ہوئیں پھر اشاروں کنایوں میں باتیں ہوئیں۔ پھر کھلم کھلا تقاضے ہوئے۔ چھوٹے میاں نے تنگ آکر کئی مرتبہ نقشہ اٹھایا اور اس میں ترمیم کرنے بیٹھے مگر اکتا کر پھر رکھ دیا۔ تقاضوں نے اظہار بے اعتمادی کی شکل اختیار کر لی۔

جبار شیخ بولے۔ ''اجی چھوٹے میاں کی عمر گزر گئی۔ یہ کام اب ان کے بس کے نہیں ہیں۔''

ہادی بھائی کہنے لگے۔ ''تو پھر وہ اس کام سے چپٹے ہوئے کیوں ہیں۔ کسی اور کے سپرد کر دیں۔''

''اور کیا۔'' رنجر جعفری نے تائید کی۔ ''اب چھوٹے میاں نے عمر بھر کا ٹھیکہ تو سارے کام کرنے کا نہیں لیا ہے۔ اب دوسرے ذمہ داری سنبھالیں۔''

پہلے یہ فقرے دبی زبان سے ادا ہوئے پھر ان کا لہجہ بلند ہوا۔ بلند سے ترش اور ترش سے تلخ ہوا۔ جب سب ایک زبان ہوگئے تو چھوٹے میاں کیا کرتے، انہوں نے نقشہ جبار شیخ کے سپرد کر دیا اور کہا کہ ''بھئی میں تو تھک گیا ہوں۔ عمر کا تقاضا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔''

جبار شیخ نے شروع میں بڑی تیزی دکھائی۔ نقشہ تو انہوں نے میز کی دراز میں رکھا اور کہا کہ ''نقشہ میں تو میں میخ نکلتی رہے گی۔ اس پہ لعنت بھیجو'' انہوں نے چندہ جمع کر کے فوراً اینٹوں اور سیمنٹ کا آرڈر دے دیا۔ ہفتے بھر کے اندر اندر پلاٹ میں ایک طرف اینٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اس کے برابر سیمنٹ کی بوریاں آپڑیں۔ انہیں دنوں جبار شیخ کا کراچی جانا نکل آیا۔ کراچی وہ کوئی ایک مہینہ تک رہے ہوں گے۔ وہاں سے واپس آئے تو اپنی تجارتی سرگرمیوں سے متعلق فکروں کی ایک پوٹ ساتھ لائے۔ تین چار مہینے پلک مارتے گزر گئے اور سیمنٹ کی بوریاں اور اینٹیں اسی طرح پڑی رہیں۔

ایک روز اچانک بڑی بھابی کو خیال آیا۔ ''اجی یہ زمین کیا خالی پڑے پڑے انڈے دے رہی ہے۔''

جوتے والی بھابی کی آنکھوں میں چمک سی آئی مگر وہ پھر سنبھلیں اور آہستہ سے بولیں۔

''بنگالن آپا کو خبر ہوگی'' پھر بنگالن آپا سے مخاطب ہوئیں۔ ''کیوں بنگالن آپا۔ کیا کہوے ہیں جبار شیخ۔ کوارٹر کب تک بن جاویں گے۔''

بنگالن آپا پہلو بچاتے ہوئے بولیں۔ ''اجی مجھے تو کچھ خبر ہے نہیں، تمہارے دیور ہی جانیں۔ آج کل تو وہ اپنی فکروں میں رہویں ہیں۔''

بڑی بھابی تلخ انداز میں کہنے لگیں۔ ''بڑے بنیں گے فلیٹ۔ بس رہنے بھی دو۔ ان لوگوں کے بس کا کچھ نہیں ہے۔ میں تو کہوں ہوں کہ کچے پکے دو چار گھر تھپوالیں، ہم وہیں جا پڑیں گے۔''

جوتے والی بھابی نے تائید کی۔ ''اے اور کیا کچی دیواری کھنچوالیں اس پہ چھپڑ ڈلوالیں اللہ اللہ خیر سلا۔''

جوتے والی بھابی نے فوراً ہادی بھائی سے ذکر کیا۔ ہادی بھائی کو خیال آنے کی دیر تھی انہوں نے چھوٹے میاں، پروفیسر شاہ، رنجر جعفری، باری باری سب سے جا کر پوچھا کہ آخر کوارٹر کب بن رہے ہیں اور سب کو ایک ساتھ خیال آیا کہ واقعی یہ تو مہینوں گزر گئے اور معاملہ جوں کا توں ہے۔''

پروفیسر شاہ بولے۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جبار شیخ اپنے کسی چکر میں ہیں۔''

''اجی وہ بات یہ ہے۔'' ہادی بھائی بولے۔ ''وہ تو کراچی جا کر ایکسپورٹ امپورٹ کا دھندا کرنے کی فکر میں ہیں۔''

رنجر جعفری کو اس پر بڑا طیش آیا۔ ''اچھا! ہاں ہاں وہ ضرور جائیں مگر فلیٹوں کے کام کو کیوں الجھا رکھا ہے خود نہیں کر سکتے تو کسی اور کے سپرد کر دیں۔''

رفتہ رفتہ یہ باتیں جبار شیخ تک بھی پہنچنے لگیں۔ پہلے تو انہوں نے ایک کان سنا اور دوسرے کان اڑا دیا۔ لیکن جب شکایتیں زیادہ ہوئیں تو انہوں نے سب کو دلاسا دیا کہ پندرہ دن کے اندر اندر میرا کام نبٹ جائے گا۔ اس کے بعد شروع کرا دوں گا۔ پندرہ دن بڑی بے چینی سے گزرے۔ جبار شیخ اس کے بعد ایک دن پلاٹ دیکھنے گئے ایک دو چکر کاٹے، گھر آ کر نقشہ نکال کر دیکھا، بہت دیر تک اس پہ جھکے رہے، آخر ان کی آنکھوں میں ترمرے آ گئے اور

انہوں نے تھک کر نقشہ پھر میز پہ رکھ دیا۔ میز پہ نقشہ ڈیڑھ دو مہینے تک اسی طرح رکھا رہا۔ لوگوں میں پھر بے چینی اور پھر کھسر پھسر شروع ہوئی۔ کبھی رنجر جعفری پوچھتے۔ ''کیوں شیخ جی کام کب شروع کرا رہے ہو؟'' کبھی ہادی بھائی سوال کر بیٹھتے ''ارے بھئی، فلیٹ کب تک تیار ہو جائیں گے؟'' ایک روز بڑی بھابی نے بڑی بیزاری سے کہا ''کیوں بھیا اب کی گرمیاں بھی اسی ڈوبے گھر میں گزریں گی۔ میرا تو بس اب کے دم گھٹ جاوے گا۔'' لیکن کسی کی پیش نہ گئی۔ جبار شیخ ہر سوال کو آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیتے۔ آخر تنگ آ کر سب نے چھوٹے میاں سے کہا کہ ''چھوٹے میاں آپ بزرگ ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں گے۔ یہ کام ہوتا نظر نہیں آتا۔''

چھوٹے میاں نے جبار شیخ کو بلا کر کچھ دبے انداز میں ڈانٹا کچھ سمجھایا اور کہا کہ ''تم دوسرے چکروں میں گرفتار ہو۔ تم سے یہ کام نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ جعفری کے سپرد کر دو۔ اسے کام کا تھوڑا بہت تجربہ بھی ہے۔ کام جلدی ہو جائے گا۔''

جبار شیخ کو بڑا تاؤ آیا، اپنے کمرے میں جا کے گرد میں اٹا ہوا نقشہ اٹھایا اور رنجر جعفری کو دے آئے۔ رنجر جعفری نے جلدی جلدی نقشہ میں دو ایک ترمیمیں کیں۔ دوسرے ہی دن مزدور ٹھہرائے اور کام شروع کرا دیا۔ اچانک ہادی بھائی کو ایک خیال آیا اور وہ بھاگے بھاگے چھوٹے میاں کے پاس پہنچے۔ ''چھوٹے میاں یہ تو بڑا غضب ہے کہ مکان بنیں، دکانیں بنیں، باغ باغیچے لگیں اور مسجد نہ بنے!''

چھوٹے میاں نے ان کی بات کی تائید کی۔ رنجر جعفری مزدوروں کو لگا چکے تھے۔ فلیٹوں کا نقشہ ابھی پوری طرح مرتب نہ ہوا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہٹاؤ پہلے مسجد کی تعمیر شروع کرا دیں۔ چنانچہ نیو کھدنی شروع ہوگئی۔

نیو کھدی، پھر دیوار کی چنائی شروع ہوگئی۔ لیکن ابھی ایک ہاتھ اونچی دیوار اٹھی تھی کہ پروفیسر شاہ نے ایک عجیب وغریب مسئلہ کھڑا کر دیا۔ پروفیسر شاہ کسی زمانے میں خاکسار رہ چکے تھے۔ مسجد کی تعمیر پر وہ خوش ہوئے۔ مگر پھر انہوں نے اعتراض کیا کہ مسجد کا رخ قبلہ کی طرف نہیں ہے۔ اس پہ سب کے سب چکرا گئے۔ جعفری نے کہا۔ ''پروفیسر تم عجب بات کرتے ہو۔ دوسری مسجدوں کی سمت دیکھ کر اس کی سمت متعین کی گئی ہے۔''

پروفیسر شاہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ کہ ’’ہندوستان اور پاکستان کی تمام مسجدوں کا رخ غلط ہے۔‘‘

’’تمام مسجدوں کا رخ غلط ہے؟‘‘ چھوٹے میاں حیران ہو کر بولے۔

’’جی‘‘

ہادی بھائی جل بھن کر بولے۔ ’’میاں گھاس کھا گئے ہو یا عقل کہیں چرنے گئی ہے۔‘‘

پروفیسر شاہ بولے۔ ’’میں کچھ جانتا نہیں، جدید جغرافیہ یہی کہتا ہے۔‘‘

’’اچھا آیا ہے جدید جغرافیہ‘‘ چھوٹے میاں گرم ہوئے۔ ’’اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہمارے سارے بزرگ اب تک نماز غلط پڑھ رہے تھے۔‘‘

’’جو کچھ بھی آپ سمجھیں بہر حال یہ مسجد بنے گی تو قبلہ رو بنے گی‘‘ اور یہ کہہ کر پروفیسر شاہ اپنے گھر کی طرف ہو لئے۔

جعفری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ فی الحال مسجد کی تعمیر روک دی جائے اور کوارٹروں کی تعمیر شروع کرادی جائے۔ چنانچہ کوارٹروں کی نیو کھدنے لگی۔ اسی عرصے میں انہوں نے کچھ درختوں اور پھولوں کی پود اور بیج منگوا لئے تھے۔ رنجر جعفری نے پیسہ اللے تللے سے خرچ کیا۔ دھیلے کی جگہ پیسہ اور پیسے کی جگہ اکنی خرچ کی۔ روپیہ ختم ہو گیا۔

جعفری نے چندے کی مہم شروع کی تو محل والوں نے اعتراض کیا کہ ابھی تو ایک دیوار بھی کھڑی نہیں ہوئی اور روپیہ خرچ ہو گیا۔ روپے کے کیا پاؤں لگ گئے۔ رنجر جعفری نے پائی پائی کا حساب دینے کے دعویٰ کے ساتھ اخراجات کی فہرست پیش کی پھلواری کی رقم ہادی بھائی کو زیادہ نظر آئی۔ رنجر جعفری نے جواب دیا۔ ’’ہادی بھائی آپ کو خبر بھی ہے یا یونہی اعتراض کر دیا۔ مسجد کے احاطہ میں جو گملے رکھے ہیں، ان کے بیج مدینہ منورہ سے آئے ہیں۔ اب اس میں خرچ ہوتا یا نہ ہوتا۔‘‘

ہادی بھائی اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔ لیکن چھوٹے میاں کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے۔ ’’عرب کے ریگستان میں گلاب، چنبیلی ہوتا ہے؟‘‘

اس سوال پر سب کے سب چونک پڑے۔ رنجر جعفری بھی کچھ سٹپٹائے اس موقعہ پر سیدانی آپا کی معلومات بہت ہی کام آئیں۔ کہنے لگیں۔ ’’چھوٹے میاں ہمیں اور کچھ تو معلوم

نہیں مگر شہادت نامے میں صاف لکھا ہے کہ جب شب عاشورہ کو حضرت قاسم کا بیاہ ہوا تو بی بی زینب نے اپنے ہاتھوں سے سہرا تیار کیا۔ گلاب چنبیلی کے پھول نہ ہوتے تو سہرا کہاں سے تیار ہو جاتا؟‘‘

پروفیسر شاہ کو لگے ہاتھوں انیس کا ایک شعر یاد آ گیا۔

پیاسے جو زہر گلشن زہرا تھے آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

رنجر جعفری کا پلہ بھاری ہو چلا تھا۔ لیکن جبار شیخ کو ایک نئی سوجھی۔ ’’کیوں جناب خانہ خدا میں اس قسم کی عیش و عشرت کی چیزیں ہونی چاہئیں۔ کیا عہد نبوی میں مسجدوں میں پھلواری ہوتی تھی!‘‘

رنجر جعفری ہر سوال کا جواب لے آئے تھے۔ لیکن اس سوال پر کھیل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محل والوں کو یقین ہو گیا کہ رنجر جعفری فضول خرچی کر رہے ہیں۔ ایسی فضول خرچی جو شرع کے بھی خلاف ہے۔ چندہ دینے سے ایک طرف سے سب نے انکار کر دیا۔ رنجر جعفری کو اس کے سوا کچھ چارہ نظر نہ آیا کہ کام روک دیا جائے اور مزدوروں کو رخصت کر دیا جائے۔ دیواروں کی نیویں ادھ کھدی رہ گئیں۔ سارے پلاٹ میں مٹی کے ڈھیر پڑے تھے اور قد آدم کھائیاں۔ ایک گوشے میں مسجد کی چار دیواری تھی جو ڈیڑھ فٹ کی بلندی پہ چھوڑ دی گئی تھی۔ اینٹیں جب آئی تھیں۔ تو ایک چوڑی فصیل کی شکل میں چنی ہوئی تھیں۔ اب وہ کچھ بکھر گئی تھیں۔ ایک سیمنٹ کی بوری بھی کھلی پڑی تھی۔ گارا ابھی گیلا تھا۔ بچوں کو ایک نیا شغل ہاتھ آیا۔ انہوں نے گیلی بادامی مٹی ہاتھوں میں بھری اور گولے بنانے شروع کر دیئے۔ ایک لڑکا اس مشغلے سے اکتا گیا تو نل پہ پہنچ کے اس نے ٹب میں تھوڑا سا پانی بھرا، پھر گود میں سیمنٹ بھر کے لایا، اسے گیلا کیا اور گولے بنانے شروع کر دیئے۔ چاندنی راتوں میں یہاں چور سپاہی اور آنکھ مچولی کے کھیل شروع ہو جاتے کوئی لڑکا مسجد کی ادھ بنی دیوار کے پیچھے جا چھپتا، انہیں بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہو جاتی، اندھیرا ان کے جسموں پر عمل کرنے لگتا، ایک تاریک برقی رو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی اور ان میں ایک ان دیکھا انجانا ربط قائم کر دیتی، برقی رو دوڑتی رہتی۔ پھر وہ جسم قریب ہوتے چلے جاتے اور پھر وہ کھائی سے ایک نیا تجربہ

حاصل کر کے نکلتے۔

جب کئی مہینے اس طرح گزر گئے تو محل والوں میں پھر ہنڈیا پکنی شروع ہوئی۔ جو لوگ اس وقت بہت مشتعل تھے، ان کا غصہ دھیما پڑ چلا تھا۔ جو چندے کی ایک پائی دینے کے روادار نہ تھے وہ اب پوری رقم دینے کو آمادہ تھے۔ رنجو جعفری کو اچانک جھرجھری آئی۔ ایک روز جب وہ چندے کی مہم شروع کرنے کا ارادہ کر رہے تھے تو برسات کا پہلا بادل آیا اور سارے شہر کو جل تھل کر گیا۔ اس کے بعد وہ بارشیں شروع ہوئیں کہ خدا کی پناہ۔ سارے پلاٹ میں پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ کھائیوں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا کہ نہریں بہہ رہی ہیں۔ کھائیوں کی نکلی ہوئی مٹی بہتی بہتی سیمنٹ کی بوریوں کے قریب جا پہنچتی تھی۔ سیمنٹ کی ایک دو بوریاں کھل گئی تھیں اور ان کا سیمنٹ جھڑ کر پانی سے خراب ہو رہا تھا۔

کوارٹروں کی تعمیر کی مہم برسات کے ریلے میں بہہ گئی۔ خدا خدا کر کے بارشیں ختم ہوئیں۔ مگر بارشوں کے ختم ہونے کی کوئی تاریخ تو ہوتی نہیں اور اگر قطعی تاریخ ہو بھی تو کیا ضرور ہے کہ برسات سے معطل ہونے والے کام دوسرے ہی دن یاد آ جائیں۔ برسات کی سیلن تو مہینوں نہیں اترتی۔ واقعہ یوں ہے کہ برسات کے بھولے بائیس رجب کو جا کر جاگے۔ ہوا یوں کہ بڑی بھابی کو نیاز کی پوریاں پکانی تھیں۔ انہیں چولہے کے لئے کوری اور پاکیزہ اینٹوں کی تلاش ہوئی۔ بنگالن آپا نے کوارٹروں کی اینٹیں منگانے کی رائے دی۔ بڑی بھابی نے جھٹ پٹ تھوڑی سی اینٹیں منگائیں۔ ایک چولہا بنگالن آپا نے بنایا، دوسرا بڑی بھابی نے اور پوریاں پکانی شروع کر دیں۔ جوتے والی بھابی نے کوری کوری اینٹیں دیکھیں تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر رات ہو چکی تھی۔ اب وہاں سے ان کے لئے اینٹیں کون اٹھا کر لاتا۔ رنجرنی نے دوسرے ہی دن جا کر سیدانی آپا سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ سیدانی آپا نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔ ''ہاں بھیا ہمیں بیوقوف ہیں بڑی بھابی عقلمند ہیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ فلیٹ تو بنیں گے نہیں اینٹیں ہی اٹھوا لو۔''

اس واقعہ کا سارے محل والوں میں چرچا ہو گیا۔ بڑی بھابی کا تو رعب داب ایسا تھا کہ ان کا کسی نے نام زیادہ نہیں لیا، لیکن بنگالن آپا کے خلاف تو خوب خوب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ رضیہ اور عتیق کا قصہ دبا ہوا تھا۔ وہ اب اچانک ابھر آیا۔ محل والیوں

نے رضیہ کی ساڑھی تو جیسے تیسے برداشت کر لی تھی۔ مگر اس کی بے پردگی پر سب کی انگلیاں اٹھیں۔ اس کی حمایت میں ایک بی بی نے رنجرنی کی بے پردگی کی مثال پیش کی۔ مگر رنجرنی نے اپنا پہلو بچا لیا کہنے لگیں۔ ''بی بی بات یہ ہے کہ بمبئی کے مہاجر کیمپ میں ہم مہینے بھر تک بے پردہ پڑے رہے۔ کب تک برقعے میں گھٹتے رہتے، آخر پردہ اٹھا دیا اور بی بی میرا کیا ہے۔ مجھے اب کون سی شادی کرنی ہے۔''

جوتے والی بھابی نے فوراً تائید کی۔ ''ہاں بی بی بیاہیوں کا کیا پردہ۔ آنکھ کی شرم ہو۔ بس یہی بہت ہے۔ پردہ تو کنواریوں کا ہووے ہے۔''

بڑی بھابی تلخ انداز میں بولی۔ ''اجی اب کنواریاں بھی پردہ نہیں کرتیں۔ پاکستان میں آ کے تو ایسی ڈوب پڑی ہے کہ جس لونڈیا کو دیکھو طباخ سامنہ لئے پھرے ہے۔ کم بختیں اڑی جاتی ہیں۔''

سیدانی آپا نے اس چرچے سے خاصا اثر قبول کیا اور گھر جا کر پروفیسر شاہ سے شکائتیں کیں کہ ''بنگالن آپا کی لونڈیا ہمارے لونڈے کو بگاڑ رہی ہے۔''

پروفیسر شاہ بولے ''تو لونڈے کو روکو نا، وہ کیوں بگڑ رہا ہے۔''

''اجی وہ غریب کیا کرے۔'' سیدانی آپا بولیں۔ ''رضیہ حرافہ اسے اڑائے اڑائے پھرے ہے۔ ہمیں جوان لڑکے لڑکیوں کا ایسی آزادی سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔''

عتیق نے صرف رضیہ کے نرم شانوں کو ہی نہیں چھوا تھا۔ بلکہ اس سے آگے بھی اسے رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ پکچر ہاؤس کے اندھیرے میں عتیق رضیہ سے کہہ رہا تھا۔ ''معلوم ہے تمہارے گال مجھے کیسے لگتے ہیں۔''

''کیسے لگتے ہیں؟''

''جیسے بنگالی رس گلے ہوں، شیرینی سے لبریز۔''

رضیہ ہنس پڑی۔

رضیہ آج پھر عتیق کے ساتھ فلم دیکھنے چلی گئی تھی۔ بنگالن آپا، جبار شیخ پہ بگڑ رہی تھیں۔ ''بڑا آیا ہے کہیں کا۔ ہو گا تمہارا سگا۔ مگر لونڈیا کو ہم کیسے بدنام کرا لیں۔''

رضیہ اور عتیق میں جتنا ربط بڑھا جبار شیخ اور پروفیسر شاہ میں اتنی ہی ناچاقی پیدا ہوئی

جوتوں والی بھابی نے اس ناچاقی کو خوب ہوا دی۔ وہ جو عتیق سے آمنہ کی شادی کا خواب دیکھ رہی تھیں اس پر اب پانی پھرا جا رہا تھا۔

ہادی بھائی ایک روز خبر لائے کہ پلاٹ سے سیمنٹ کی تین بوریاں غائب ہو گئی ہیں۔

سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔

رنجرنی رنجر جعفری سے کہہ رہی تھیں۔ ''اجی یہ ہادی بھائی ہیں تو تمہارے چہیتے بھئے، مگر ہیں بہت چلتا پرزہ۔ کہیں انہوں نے ہی تو بوریاں برابر کے پلاٹ والوں کو چپکے سے نہیں سرکا دیں۔''

''تمہارا کیا ہے۔ تم کل کو مجھ پہ شبہ کرنے لگو گی۔''

سیدانی آپا اور جوتوں والی بھابی بہت دیر سے اپنے کمرے میں بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ سیدانی آپا کہہ رہی تھیں۔ ''شک تو مجھے بھی انہیں پہ پڑے ہے''

''اجی ابھی تک تم شک میں ہی ہو'' جوتوں والی بھابی بولیں۔ ''جس روز بنگالن آپا نے چولھے کے لئے اینٹیں منگائی تھیں۔ میرا اسی روز ماتھا ٹھنکا تھا۔ جبار شیخ نے دیکھ لیا کہ کوئی کچھ کہتا تو ہے ہی نہیں لاؤ ذرا ڈبل ہاتھ مارو۔''

''اری بی بی یہ کیا خبر کہ یہ پہلی دفعہ ہوا ہے۔ اب اتنی اینٹیں گن کے تو رکھی نہیں ہیں۔ نہ معلوم کتنی اینٹ سرکا دی ہو۔''

''ہاں ہاں اور کیا'' جوتوں والی بھابی بولیں۔ ''اور اس کی بھی کیا خبر ہوتی وہ تو یہ کہو کہ اتفاق سے تمہارے جیٹھ نے جا کے بوریاں گن لیں۔ اب اینٹیں تو نہیں گنی جاتیں۔''

''بھئی بات یہ ہے کہ اپنے جبار شیخ ایکسپورٹر امپورٹر بن گئے ہیں۔''

''مگر ہادی بھائی۔ یہ خیرات گھر سے کیوں شروع ہوئی۔ اچھے ایکسپورٹر بنے گھر کا مال ہی ایکسپورٹ کر ڈالا۔''

جبار شیخ آگ بگولا ہو رہے تھے۔ چھوٹے میاں نے سمجھایا۔ ''بھیا! غصہ تھوک دو آپس میں اگر ہم لڑنے لگے تو پھر مل کے کس کے ساتھ بیٹھیں گے۔''

''تو چھوٹے میاں آپ یہ چاہتے ہیں کہ پروفیسر شاہ مجھ پہ چوری کا الزام لگائے اور میں اس کے ساتھ مل کر بیٹھوں، نا صاحب ہم ایسی آپس داری کے قائل نہیں ہیں۔ ہماری کسی

سے آپس داری نہیں ہے۔''

''بھائی، کس نے تم پہ چوری کا الزام لگایا اور اگر کسی نے لگایا بھی ہے تو یہ کیسے تحقیق ہوئی کہ وہ پروفیسر شاہ ہے۔''

جبار شیخ بگڑ کے بولے۔ ''اجی مجھے تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب اس سے ملنا ہی نہیں ہے۔ کیوں تحقیق کروں۔''

''بڑی بھابی بات یہ ہے کہ'' بنگالن آپا کہہ رہی تھیں۔ ''جو ہم سے مل کے چلے گا ہم اس سے ملیں گے اور جو ہم سے آنکھ ناک مروڑے گا ہم نے اسے جوتی کی نوک پہ دھر کے مارا ہے۔ سیدانی آپا سے کہہ دیجو کہ بی بی بیٹا کسی قابل ہو جاوے تو اکڑیو۔ بڑا ہے نالائق فائق جو میں اسے اچکنے کی کوشش کرتی۔''

بڑی بھابی کہنے لگیں۔ ''بی بی میں تو تمہاری لڑائی دیکھ کے بولائی جا رہی ہوں۔ ہمارے خاندان میں کبھی کاہے کو ایسے بہتان لگے تھے۔ توبہ توبہ برا زمانہ آیا ہے۔''

بنگالن آپا نے بڑی بھابی کے فقروں کو شاید سنا ہی نہیں۔ انہوں نے پھر سلسلہ گفتگو جاری کر دیا۔ ''اور بڑی بھابی رہی بے پردگی کی بات تو ہاں ہاں ہماری بیٹی پردہ نہیں کرتی۔ آج کل بڑے بڑے شریفوں کی بیٹیاں گھر سے بے پردہ نکلتی ہیں، وزیراعظموں کی بیویاں کھلے منہ پھرتی ہیں، ہماری تو بساط کیا ہے۔ اجی ہماری بیٹی کی بے پردگی کا تو عالم آشکارا ہے۔ مگر جن بیبیوں کی بیٹیاں پردے کرتی ہیں وہ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالیں۔ کوئی بات چھپی نہیں رہا کرتی۔ خدا کو آنکھ سے نہیں مگر عقل سے تو پہچانا ہے۔''

ان آخری فقروں پہ جوتوں والی بھابی بہت تپیں۔ ''بنگالن آپا، یہ تم نے کیا بات کہی کہ کسی کی بات چھپی نہیں رہا کرتی۔''

بنگالن آپا نے فوراً صفائی پیش کی۔ ''جوتوں والی بھابی، سیدھی بات کو اپنے اوپر مت لے جایا کرو۔ تمہاری بیٹی کا ذکر نہیں ہے۔ میں نے تو دنیا کی بات کہی ہے۔''

الجھنوں میں اضافہ ہوتا گیا، لڑائی بڑھتی گئی۔ گھمسان کی لڑائی میں یوں بھی ہوتا ہے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی ہوئی گرد سے سارا میدان اٹ جاتا ہے اور اس میں دوست دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ سپاہی تلوار چلانا اپنا مقصد سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کس پہ چل رہی

ہے۔ کچھ یہی عالم اس وقت محل والوں پہ گزر رہا تھا، سب لڑ رہے تھے، ایک دوسرے کے خلاف ایک دوسرے کے ساتھ مل کر۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کس کے ساتھ ہے، اور کس کے خلاف ہے۔ ایک روز نوبت یہاں تک پہنچی کہ جبار شیخ اپنی بندوق لے کر نکل آئے اور پروفیسر شاہ کو گالیاں دینے لگے۔ چھوٹے میاں بڑی مشکل سے دبوچ دباچ کر انہیں اندر لائے۔ اس واقعہ کا محلے میں اس حد تک چرچا ہوا کہ خبر تھانے جا پہنچی۔ تھوڑی ہی دیر میں گھم گھم پولیس آگئی۔ پولیس کیا آئی کہ سارے محلے میں تہلکہ پڑ گیا۔

"یہ دوڑ کہاں آئی ہے؟" پولیس والے جب پاس سے گزر گئے تو ایک شخص نے ہراس آمیز انداز میں پرچونئے سے پوچھا۔

پرچونئے نے جواب دیا۔ "محل والوں میں لڑائی ہوگئی ہے۔ ان کے ہاں آئی ہے۔"

"محل والوں کے گھر دوڑ آئی ہے۔" یہ فقرہ آگ بن کر محلے بھر میں پھیل گیا۔ جس نے خبر سنی دہل کر رہ گیا۔

چھوٹے میاں پر اس واقعہ کا عجب اثر ہوا۔ انہیں محل والوں کا گذرا ہوا زمانہ رہ رہ کر یاد آیا۔ محل والوں کی ایسی بے عزتی کبھی کاہے کو ہوئی تھی۔ جج صاحب کے زمانے میں تو یہ حال تھا کہ محل والوں کے چوہے کے بچے کو بھی پولیس والے سر آنکھوں پہ بٹھاتے تھے۔ ان کے بعد اگرچہ وہ کروفر نہیں رہا۔ مگر ساکھ تو قائم تھی اور عید بقرعید کے موقعوں پر تھانیدار چھوٹے میاں کو سلام کرنے آیا کرتا تھا۔ ہجرت نے ساکھ کے اس اوپری خول کو بھی اتار پھینکا اور آپس کا جھگڑا وہ رنگ لایا کہ محل والوں کی عزت ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گئی۔ چھوٹے میاں کو بے عزتی کا غم کھائے جا رہا تھا اور باقی محل والے پولیس کے آنے سے دہل گئے تھے۔ چند دنوں تک وہ سناٹا رہا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ محل والے وجود ہی نہیں رکھتے یا ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ سناٹا پیدا ہوا تو اپنی حالت پہ غور کرنے کا موقعہ ملا۔ رنجر جعفری کو اب احساس ہوا کہ جتنی رقم وہ لے کر آئے تھے اس میں سے بس تھوڑے سے روپے باقی ہیں۔ ہادی بھائی کی حیثیت ہی کیا تھی۔ تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی وہ ٹھکانے لگ چکی تھی اور اب فاقوں کی نوبت آ چلی تھی۔ جبار شیخ نے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا تھا مگر خاندانی جھگڑوں میں وہ ایسے لگے کہ وہ سارا کاروبار چوپٹ ہوگیا۔ چھوٹے میاں کی حالت بھی پتلی تھی۔ انہیں یہ فکر

کھائے جا رہی تھی کہ کہیں غربت میں افلاس کی ذلت بھی اٹھانی نہ پڑے۔ پلاٹ کو بیچنے کا خیال نہ معلوم پہلے کس کے ذہن میں آیا تھا۔ مگر جب اس کا اظہار ہوا تو پتہ چلا کہ سب یہی سوچ رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اس تجویز کے پیش کرنے والے کا پتہ نہ چل سکا۔ عورتوں میں جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اس کی ایسی مخالفت نہیں کی۔ جوتوں والی بولی "بی بی بات یہ ہے کہ ہماری ایسی کون سی بڑی حیثیت ہے۔ تھوڑی سی رقم لے کے یاں آئے تھے۔ وہ ساری رقم اس زمین میں ڈوب گئی۔"

بڑی بھابی کہنے لگیں۔ "کمبخت پیسہ بھی گیا اور دلوں میں فرق بھی پڑ گئے۔ ایسے تین ایکڑ خریدے کہ محل والے تین تیرے ہوگئے۔"

سیدانی آپا کہنے لگیں۔ "بڑی بھابی بعضی بعضی زمین راس نہیں آتی۔ یہ زمین بک جائے تو اچھا ہی ہے۔ میں تو جانوں کہ کسی نے وہاں سیہ کا کانٹا گاڑ دیا ہے۔ روز لڑائی ہوتی ہے۔"

"خیر بی بی میں یہ تو نہیں کہوں گی۔" بڑی بھابی کہنے لگیں۔ "زمین پڑی رہتی تو اچھا ہی ہوتا۔ کبھی توفیق ہوتی تو جھونپڑا ڈال کے پڑ رہتے۔"

جوتوں والی بھابی نے کہا۔ "اجی بس رہنے دو بڑی بھابی ہمارے مردوں کے بس کا نہیں ہے یہ کام اور بی بی سچی بات ہے۔ ہمارے گھر تو فاقے ہونے لگے۔ زمین کو لے کے کیا اچار ڈالیں گے، اور پھر روز روز کا جھگڑا۔ بک جائے تو پاپ کٹے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

بڑی بھابی بڑے تلخ لہجہ میں بولیں۔ "اری بی بی تو پھر خریدنے کا کیا شوق مارا جاتا تھا۔ میں تو یہ جانوں ہوں کہ تیری ماں نے خصم کیا برا کیا، کر کے چھوڑ دیا اور بھی برا کیا۔"

پلاٹ کی حالت اب کچھ اور خستہ ہوگئی تھی۔ اینٹیں جس وقت آئی تھیں دور سے دھوپ میں سرخ انگارہ لگتی تھیں۔ برسات میں ان کا رنگ سرخ سے زرد ہوا۔ برسات گزرنے پر زردی میں سیاہی کا رنگ شامل ہوا اور باریک سفید پرت جمنے لگا۔ سیمنٹ کی بوریاں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ ان کے اندر جو سیمنٹ ہوگا وہ محفوظ ہی ہوگا۔ باہر جو سیمنٹ پڑا تھا اس نے زرد مٹی میں مل کر ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی۔ کھائیاں اب بھرتی جا رہی تھیں۔ مگر عجب انداز سے۔ آس پاس کے مکانوں کا سارا کوڑا کرکٹ اب ان کھائیوں میں پڑنے لگا تھا۔ مہترانیاں آتیں اور نجاست کے ٹوکرے الٹ جاتیں۔ ایک سمت میں کھائی بالکل پر ہو چکی تھی اور اچھا خاصا

ایک گھورا بنتا جا رہا تھا۔ کسی سمت سے مرغیوں کا غول آتا اور کوڑے کو پوری گرمجوشی سے پنجوں اور چونچوں سے کریدتا اس گھورے کی مٹی میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ ایک اونچے سرخ مرغے کو اس میں چہل قدمی کرتے کرتے ادبدا کر جوش آ جاتا، آس پاس گھومتی ہوئی کسی مرغی کو وہ شدت سے دبوچ لیتا، اس کی چونچ مرغی کے سر پہ ہوتی اور اس کے سرخ بازو اس کے پورے جسم کو ڈھانک لیتے۔ دونوں جسم ایک دوسرے میں مدغم ہو کر پروں کا ایک گرم کانپتا ہوا پلندہ بن جاتے۔ پھر مرغا الگ ہو کر پر پھڑ پھڑاتا اور بانگ دے کر پھر گھورے کو کریدنے لگتا۔ کبھی کوئی کھجلی کا مارا ہوا کتا اس طرف کا رخ کرتا اور کسی کھائی میں مکھیوں سے چھپ کر پڑ رہتا۔ وہ اونگھتا رہتا، اونگھتا رہتا، پھر یکا یک اسے بے چینی ہوتی، وہ کھڑا ہو کر جھرجھری لیتا، کسی سوکھے ہوئے گلاب کے گملے کو سونگھتا، اس پہ ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرتا اور پھر بے مقصد، بے منزل نامعلوم سمت میں چل پڑتا۔

پلاٹ بیچنے کا خیال' تجویز بنا اور تجویز نے فیصلے کی شکل اختیار کی۔ محل والوں کے سارے مرد چھوٹے میاں کے کمرے میں جمع ہوئے۔ پلاٹ کی خریداری کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ محل والوں نے مل جل کر ایک مسئلے پر سوچ بچار کیا۔

چھوٹے میاں نے اندر جا کر ذکر کیا تو بڑی بھابی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔

''غضب خدا کا، ساری جائداد واں غارت ہوگئی۔ یاں ایک زمین کا نوالہ مل گیا تھا، سو اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔''

چھوٹے میاں کا برف سا سر جھک گیا اور کانپتی ہوئی انگلیاں ڈاڑھی کے سفید بالوں میں بھٹکنے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر کسی خیال میں گم بیٹھے رہے پھر نیم رقت آمیز لہجہ میں کہنے لگے۔

''کسی کا کیا مقدور ہے۔ جج صاحب کے مرنے سے اس گھر پہ زوال آ گیا۔ محل والوں کی بہتری قدرت کو منظور نہیں۔''

اس رات بہت دنوں بعد محل والوں کو محل یاد آیا، جواب متروکہ جائداد قرار دے دیا گیا تھا اور جج صاحب یاد آئے جن کی تصویر چلتے وقت سامان سے کہیں گم ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

یاں آگے درد تھا

اس کالج کی عمارت عجب بے ترتیبی سے بنی ہے۔ ایک طرف سب سے الگ تھلگ مثلث کی شکل میں چند کمرے بنے ہوئے ہیں۔ پھر اس سے بالکل ہٹ کر کمروں کی ایک مختصر قطار نظر آتی ہے۔ اس کے ختم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ کالج کی عمارت ختم ہوگئی۔ لیکن اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر کمروں کا ایک اور ہجوم ہے۔ جس کی شکل بگڑے ہوئے دائرے کی سی ہو گئی ہے۔ یہاں کالج ہال ہے۔ اس کے برابر پروفیسروں کا کمرہ ہے۔ پھر پرنسپل کا کمرہ ہے اور اس سے ملا ہوا لڑکیوں کا کمرہ ہے اس بگڑے ہوئے دائرے سے جب اس قطار کی طرف آتے ہیں جو آرٹس کی کلاسوں کے کمروں کا سلسلہ ہے تو رستے سے ذرا ہٹ کر الٹے ہاتھ پر ایک ویران سا آم کا درخت کھڑا ہے اور اس کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا نل ہے۔ اس نل کا ہتھا اس انداز سے لٹکا رہتا ہے کہ کوئی پرندہ ہو جس کا بازو ٹوٹ کر لٹک گیا ہے۔ نیچے کے حصے پر زنگ لگتا چلا جا رہا ہے اور ایک قسم کی زردی سی کھنڈ گئی ہے۔ کھرا جوں کا توں موجود ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں سے اس پر پانی کا قطرہ نہیں گرا۔ گرد، آم کے زرد خشک پتے، اکا دکا کتاب کا ورق، کوئی گھسی گھسائی ٹوٹی پھوٹی پنسل، ایک دو کپڑوں کے چیتھڑے، کوڑے کرکٹ کا یہ مختصر سا انبار کبھی پورے کھرے پر بکھرا ہوا ہوتا ہے، اور کبھی ہوا کے اثر سے سمٹ کر نالی پر جمع ہو جاتا ہے۔ اس نالی میں اب اتنی مٹی اَٹ گئی ہے کہ اس کا سوراخ تقریباً بند ہوگیا ہے اور اب اس کے کھلے رہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

نہ تو نل چلتا اور نہ پانی گرتا ہے اور نہ اس کے نکاس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زمین کے اس ننھے منے ویران گوشے کی فضا سے کچھ ایسا احساس پیدا ہوتا ہے جیسے یہاں کوئی نگر آباد تھا اور اب اجڑ گیا ہے، یا کوئی دریا یہاں بہتا تھا جو رستہ بدل کر اب کسی اور رخ بہنے لگا ہے۔

ویرانی کا بھی عجب طور ہے۔ بعض بستیاں بار بار اجڑتی ہیں اور اجڑ اجڑ کر بس جاتی ہیں اور بعض بستیاں بلا وجہ، بلا سبب غیر محسوس طور پر ویران ہو جاتی ہیں۔ رتیں گزر جاتی ہیں اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بستی کیوں ویران ہوئی تھی۔ اس کی موقعہ کی اہمیت باقی ہے، اردگرد شاداب زمینیں ہیں، آس پاس آبادیاں ہیں، قریب سے سڑک گزرتی ہے، لوگوں کو تاریخی اہمیت کا بھی احساس ہے اور پھر بھی کوئی اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ نشیب باقی ہے، ریتی موجود ہے، لیکن تری کا نشان نہیں، دریا نے رُخ بدل لیا ہے، کیوں بدل لیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ رونق ماجرا بن کر پھیلتی ہے اور ویرانی بھید بن کر آتی ہے۔ اس ننھے منے گوشے کی ویرانی بھید ہو یا نہ ہو، اس کی رونق کوئی ماجرا نہیں تھی۔ موقعہ تھا ہی ایسا کہ یہاں ہنگامہ رہنا چاہئے تھا۔ ہرا بھرا سایہ دار آم کا درخت، پانی کا نل، پھر کلاسوں کے قریب بھی اور کلاسوں سے الگ بھی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکیاں کالج میں داخل ہوتیں تو ادھر ہی سے نکلتیں۔ کلاس ٹوٹی ہے، کمرے میں اچانک ایک خوشگوار سے شور کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لڑکے اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر بے تحاشہ باہر نکل پڑے ہیں۔ ان کا رخ نل کی طرف ہے۔ یہ شخص جس نے نل کا ہتھا سنبھال رکھا ہے زاہد ہے۔ زاہد کو زاہد بہشتی کہا جائے تو کیا مضائقہ ہے پانی کوئی بھی پیئے نل زاہد چلاتا ہے اور کبھی کبھی اس چکر میں آنکھیں سینکنے کا موقعہ بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اے لو جگدیش کو دیکھو ابھی اوک سے پانی پی رہا تھا اور اب ادھر سے ہٹ کر پیڑ کے نیچے آ کھڑا ہوا ہے۔ یہ دوسرے لڑکے بھی زاویے بنا بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ تارا ساہنی آ رہی ہے۔ سفید ساڑھی، ماتھے پہ ننھی سی بندی، ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ، بھرا بھرا جسم، جگمگ چال --- مگر یہ کیا؟--- اس کی چال میں فرق آ جاتا ہے۔ البتہ رمولا کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ رمولا یعنی وہ بنگالی لڑکی جو اس کالج میں آ کر رمولا کہلائی اور جس کا اصلی نام معلوم کرنے کی کبھی کسی کو آرزو نہ ہوئی، اس کی آمد کا انکشاف اسی درخت کے نیچے ہوا تھا۔ تیسرے گھنٹے کے ختم پر ممتاز دوڑا دوڑا آیا۔ سلام نہ دعا، چھوٹتے ہی ایک سنسنی خیز خبر سنائی۔ ''یارو ایک نئی لڑکی آئی ہے۔ بنگالی ہے، غضب ہے، بالکل رمولا کی شکل۔''

''رمولا کی شکل؟'' سب چونک اٹھے

''قسم قرآن کی ہو بہو رمولا ہے۔''

یہ خبر نشر تو یہاں ہوئی تھی لیکن پندرہ منٹ بعد جب ریسس ختم ہوئی اور چوتھا گھنٹہ شروع ہوا تو اس درخت کے نیچے ہی لوگ چشم براہ نہیں تھے۔ بلکہ سامنے والے برآمدوں کے آگے بھی لڑکوں کی ایک طویل قطار نظر آ رہی تھی لیکن کیا مجال کہ رمولا کی چال میں ذرا فرق آیا ہو۔ گرلز روم سے نکل کر بیالوجی کی کلاس تک پہنچنے میں دو چار سخت مقام آتے ہیں۔ اس زمانے میں شاید سب سے سخت مقام یہی اڈا تھا۔ یہاں پہنچ کر اچھی اچھی مستقل مزاج لڑکیوں کی چال میں فرق پڑ جاتا تھا۔ ایک ثریا نے تو ضرور یہ رویہ اختیار کیا تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے ماتھے پر اور زیادہ شکنیں ڈال لیتی تھی۔ بہر حال وہ نوٹس تو لیتی ہی تھی۔ یہ بات رمولا ہی میں دیکھی کہ ادھر سے گزرتے وقت اس نے یہاں کھڑے ہونے والوں کے وجود کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اس نے کبھی تو اپنی ساڑھی کا پلو درست کیا نہ کسی پریشان لٹ کے سنوارنے کی ضرورت محسوس کی۔ بڑی بے اعتنائی سے گزری چلی جاتی۔ یہ بے اعتنائی تھی بہت اشتعال انگیز۔ کیا قیامت ہے کہ جس منزل سے گزرتے ہوئے لڑکیوں کے چہروں کے رنگ بدل جائیں اس منزل سے رمولا یوں گزر جائے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ شرمیلی لڑکیاں تو خیر کوئی مسئلہ ہیں ہی نہیں۔ رعونت رکھنے والی لڑکیوں سے انتقام لینا بھی ان لڑکوں کو آتا تھا۔ لیکن یہ بے اعتنائی ان کے لئے ایک نئی اور انوکھی چیز تھی اور اس سے مقابلے کی صورت ان میں سے کسی لڑکے کی سمجھ میں کبھی نہ آئی۔

اس اڈے کی ٹولی والے رمولا کا علاج نہ سوچ سکے ہوں یہ الگ بات ہے۔ ویسے ان کے دماغ سے بات یوں نکلتی تھی جیسے بوندا باندی کے عالم میں آموں کے باغ میں ٹپکا لگتا ہے۔ ہاں یہ پیڑ جو تھا نام کا آم کا پیڑ تھا اس پہ مول تو ضرور آتا تھا اور اکثر اکا دکا ہری امیاں بھی پتوں میں چھپی ہوئی نظر آ جاتی تھیں۔ لیکن آم آتے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ اس درخت پہ نہ کبھی آم آئے، نہ کبھی کوئل بولی، نہ کبھی طوطوں کی ڈار اتری نہ کسی کھوہ میں طوطوں کے بچے نظر آئے۔ پھر بھی اس کے گرداگرد ہر وقت ایک حرکت، ایک ہنگامے کی کیفیت رہتی تھی۔ لیکن آم کے درختوں پہ تو بس فصل کے زمانے میں بہار رہتی ہے۔ اس کے بعد تو وہ چپ چاپ حسرت کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔ یہ آم کا پیڑ ایک چھٹیوں کے مختصر سے زمانے کو چھوڑ کر ہمیشہ ہی آباد رہتا تھا۔ اس کالج میں تیسرے اور چوتھے گھنٹے بڑی مصروفیت کے گھنٹے ہوتے ہیں۔

تقریباً سب ہی لڑکے کلاسوں میں ہوتے ہیں۔ تیسرے گھنٹے کے ختم پہ لڑکے رواروی میں آتے، نل پہ پانی پیتے، چلتی ہوئی دو چار باتیں کرتے اور کلاسوں کو ہو لیتے۔ برآمدوں اور روشوں پر سکوت چھا جاتا۔ کلاسوں میں لیکچر شروع ہو جاتے اور طلبا دم سادھے ٹکٹکی باندھے لیکچرار کو تکتے رہتے۔ وقت کی رفتار دھیمی ہوتی اور لمحے تھکی ہوئی چیونٹیوں کی قطار بن جاتے۔ برآمدوں اور روشوں پر بدستور سناٹا چھایا رہتا اور لیکچرار کی بے کیف آواز میں اور زیادہ بے کیفی اور زیادہ یکسانی پیدا ہو جاتی اور لڑکوں کو جماہیاں آنے لگتیں، آنکھیں بند ہونے لگتیں، تھکی ہوئی چیونٹیوں کی بے رنگ قطار رینگتی رہتی اور پھر اچانک کسی کمرے میں لیکچرار کی آواز تھم جاتی اور کرسیوں اور میزوں کے سرکنے کا ایک شور ہوتا۔ پھر برابر کے کسی کمرے میں اسی انداز سے لیکچرار کی آواز تھمتی اور اسی انداز سے میزوں اور کرسیوں کے سرکنے کا ایک شور ہوتا۔ پھر یہ شور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوسرے کمرے سے تیسرے کمرے میں منتقل ہوتا چلا جاتا۔

تھکی ہوئی چیونٹیوں کا بیرنگ جلوس کہیں گم ہو جاتا اور فضا میں چراغ سے جل اٹھتے۔ لڑکے ہنستے بولتے ایک کمرے سے نکلتے اور درخت کی طرف ہو لیتے۔ پھر کسی دوسرے کمرے سے اسی انداز میں ایک ٹولی برآمد ہوتی۔ پھر مختلف کمروں سے لڑکے گروہ در گروہ نکلتے اور برآمدوں میں روشوں پہ ایک گہما گہمی پیدا ہو جاتی۔ خاموش نل کو حرکت ہوتی اور پھر وہ مسلسل شور کرتا چلا جاتا۔ ایک سبیل لگ جاتی اور پیاسوں کا جمگھٹا کم ہونے میں نہ آتا۔ پھر نل کا شور اچانک مدھم پڑ جاتا اور نگاہیں پانی سے ہٹ کر سامنے والے رستے پر جم جاتیں۔ مثلث کے کسی کمرے سے لڑکیوں کی ایک ڈار نکلتی اور فضا میں ایک دم روشنی سی پھیل جاتی۔ رنگوں میں ڈوبی ہوئی چراغوں کی ایک قطار ندی کی طرح بہتی چلی آتی اور بگڑے ہوئے دائرے والی عمارت میں جا کر گم ہو جاتی۔ سرگوشیاں اور مسکراہٹیں، بلند آہنگ فقروں اور قہقہوں کی شکل اختیار کر لیتیں اور نل پھر زور زور سے چلنے لگتا۔

یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ کانگریس کی تحریک سول نافرمانی زوروں پر تھی۔ کالج کے طلباء میں بھی خاصا جوش پھیلا ہوا تھا۔ کئی ایک مظاہرے ہو چکے تھے۔ لڑکے کلاسوں سے احتجاجاً اٹھ اٹھ کر چلے آتے، نعرے بلند ہوتے، ہجوم جلوس کی شکل اختیار کر لیتا اور یہ جلوس برآمدوں میں

اور روشوں پہ گشت کرتا اور نعرے لگاتا۔ پولیس گیٹ تک آتی اور کالج کی حدود میں داخلے کی اجازت نہ پا کر واپس چلی جاتی اور جلوس ایک برآمدے سے دوسرے برآمدے میں اور دوسرے سے تیسرے برآمدے میں جاتا اور لڑکوں کو کلاسوں سے نکل آنے پر آمادہ کرتا۔ ایک دن اس جلوس کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ اسکا رخ اس آم کے پیڑ کی طرف ہو گیا۔ پہلے نعرے لگتے رہے، پھر ایک لڑکا ترنگا جھنڈا لے کر آگے بڑھا اور درخت پہ چڑھ گیا۔ درخت پہ جھنڈا لہرا دیا گیا۔ درخت پہ جھنڈے کا لہرانا غضب ہو گیا۔ کالج میں ہر قسم کا طالب علم تھا۔ مسلم لیگی، احراری، خاکسار، کمیونسٹ، سوشلسٹ، اسلامی جماعتی جس نے یہ منظر دیکھا اسے اپنے نظریئے پہ حملہ تصور کیا۔ سارے دن کالج کی فضا میں ایک سنسنی سی طاری رہی۔ مختلف لڑکے آتے، ترنگے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے اور واپس چلے جاتے۔ پھر برآمدوں کے کونوں پر کھڑے ہو کر سرگوشیاں ہوتیں، اشارے ہوتے۔ وہ سارا دن اسی عالم میں گزرا۔ لیکن دوسرے دن کیا ہوا۔ فضا میں اور زیادہ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ترنگے کے برابر مسلم لیگ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ لڑکوں نے دیکھا اور ہکا بکا رہ گئے۔ کانگرسی طلبا کا ایک غول آیا، یہ منظر دیکھا۔ آنکھیں لال پیلی ہو گئیں، سرگوشیاں کرتا آگے بڑھ گیا۔ پھر دن بھر یہ عالم رہا کہ لڑکوں کی ایک ٹولی آتی غور سے دونوں جھنڈوں کو دیکھتی، جلدی جلدی پانی پیتی اور جھنڈوں کو تعجب اور ہراس سے دیکھتی ہوئی واپس ہو جاتی۔ کوئی دوسری ٹولی گھبراہٹ میں جلدی جلدی آتی اور درخت سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی ہو جاتی اس کی نگاہیں درخت کی پھننگ پہ لگے ہوئے دو جھنڈوں پہ جمی ہوئی ہیں۔ فضا میں خاموشی ہے، ایک تناؤ کی کیفیت ہے۔ لڑکوں کی ٹولیاں باتیں بھی کرتی ہیں اور چل پھر بھی رہی ہیں۔ لیکن باتیں سرگوشیوں میں ہوتی ہیں اور اٹھتے ہوئے قدم اپنی چاپ سے ڈرتے ہوئے اٹھ رہے ہیں۔

اور دوسرے دن جب کالج کھلا تو لڑکوں نے دیکھا کہ اب ایک تیسرا جھنڈا بھی درخت پر لگا ہوا ہے۔ یہ خاکساروں کا جھنڈا تھا۔ تناؤ کی کیفیت اور بڑھی اور کالج کی فضا میں بدستور خاموشی چھائی رہی اور نل اور نل کے آس پاس کی فضا میں ایک سناٹا سا طاری رہا۔ شام کو جب کالج ختم ہونے لگا تو اسلامی جماعت کے چند لڑکوں نے بھی پانچویں سواروں میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن جو لڑکا جھنڈا لے کر درخت پہ چڑھ رہا تھا اسے ایک خاکسار نے پکڑ کر نیچے

کھینچ لیا اور اسکا گریبان پکڑ لیا۔ اسلامی جماعت والے اس خاکسار کی اس غیر اسلامی حرکت سے بہت دل برداشتہ ہوئے۔ فوراً امیر جماعت سے رجوع کیا گیا۔ وہاں سے جواب ملا کہ نیت مستحسن ہے لیکن چونکہ فتنے کا اندیشہ ہے اس لئے اسے ملتوی کر دو۔ لیکن اپنے رفیقوں پر یہ بات جتا دو کہ ہم محض رفع شر کی خاطر علم لہرانے کے حق سے دست بردار ہوتے ہیں۔ اسلامی جماعت والوں نے اپنے رفیقوں پر یہ بات جتا دی اور مطمئن ہو گئے۔ لیکن کیمونسٹ فتنے سے کب ڈرنے والے تھے۔ ایک کیمونسٹ طالب علم کلاس سے ایک ڈیسک اٹھا لایا اور درخت کے نیچے اس پہ کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی۔ ''ساتھیو! مسلم لیگ اور کانگریس دونوں انگریز کے پٹھو ہیں۔ مسلم لیگ فرقہ پرست جماعت ہے اور زندگی کو سینکڑوں سال پیچھے لے جانا چاہتی ہے۔ کانگریس برلاؤں ڈالمیاؤں کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ خاکسار فسطائیت پرست ہیں۔'' اس تقریر کا اثر کچھ ہوا، کچھ نہ ہوا۔ لیکن دوسرے دن یہ گل کھلا کہ جن جن گدوں پر جھنڈے نصب تھے وہ قلم کر دیئے گئے تھے اور ایک سب سے اونچی شاخ پر سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ سب کے سب سناٹے میں آ گئے۔ پھر کانگریسیوں نے ایک جلوس ترتیب دیا اور کیمونسٹ مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے پورے کالج میں گشت کیا۔ مسلم لیگ سے وابستہ پر جوش طلبا نے کسی باقاعدہ جلوس کی ضرورت نہ سمجھی، ایک بہنگم سا ہجوم جمع ہو گیا اور ٹوپیاں اچھال اچھال کر نعرے لگانے لگا۔ ''ملحد مسلم ایک دو۔ اسٹالن کی ٹوپی پھینک دو'' خاکسار طلبا اینٹ پتھر لے کر لڑنے پہ آمادہ ہو گئے۔ لیکن جب کوئی کیمونسٹ نظر نہ آیا تو جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

دوسرے دن جب لڑکے کالج آئے تو دیکھا کہ جس شاخ پر سرخ پرچم نصب تھا وہ غائب ہے اور ایک دوسری شاخ پر ترنگا لہرا رہا ہے۔ دوسرے دن ترنگا معہ شاخ کے غائب ہو گیا اور سبز پرچم لہرانے لگا۔ تیسرے دن سبز پرچم والی شاخ غائب تھی۔ ایک شاخ پر خاکساروں کا جھنڈا بندھا ہوا تھا۔ چوتھے دن پھر کانگریس کا جھنڈا ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کی صورت ہی نظر نہ آئی۔

آخر ایک روز ہنگامہ برپا ہو ہی گیا۔ کالج میں اکثریت تو بہر صورت کانگریسی طلبا ہی کی تھی، انہوں نے ایک لمبا چوڑا جلوس بنایا اور نعرے لگاتے ہوئے آم کے درخت کے پاس پہنچے۔ چند لڑکوں نے درخت پہ چڑھ کے مسلم لیگ کا جھنڈا اتار پھینکا اور ترنگا لہرا دیا۔ اس پہ

سارے مسلمان طلبا میں سخت جوش پھیل گیا۔ پرنسپل نے گھبرا کر پولیس کو کالج کے اندر بلا لیا۔ پولیس دندناتی ہوئی کالج میں گھس آئی۔ مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا۔ پکڑ دھکڑی کی اور پیڑ کے پاس پہرہ لگا دیا۔

دوسرے دن سے آرٹس کی کلاسوں کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پانی کے مٹکے لا کر رکھوائے گئے اور حکم ہو گیا کہ لڑکے پانی یہاں سے پئیں اور کوئی درخت کے پاس نہ جائے۔ ایک سپاہی دن رات وہاں تعینات رہتا۔ کبھی وہ بندوق کاندھے پہ رکھے ٹہلتا رہتا اور کبھی بندوق کو اسی انداز سے کاندھے پہ رکھے رکھے وہ بالکل ساکت ہو جاتا اور یوں لگتا کہ اس کی روح پرواز کر گئی ہے اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ وہ کبھی بندوق پیڑ کے تنے سے لگا کے رکھتا اور تنے سے کمر لگا کر بیٹھ جاتا، اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں، پھر اچانک نیند کے جھونکے سے اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک کر تنے سے کھٹ سے ٹکراتا، وہ پھر چونک پڑتا اور بندوق کاندھے پہ رکھ کے پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ آس پاس خاموشی چھائی رہتی۔ لڑکے دور دور سے ہراس آمیز نگاہوں سے سپاہی کو دیکھتے اور کلاسوں میں داخل ہو جاتے پروفیسر گھنٹی شروع ہونے پر رجسٹر بغل میں دابے اپنے کمرے سے نکلتے اور نظریں جھکائے پیڑ کے پاس سے گزرے چلے جاتے۔ لڑکیاں گرلز روم سے خاموشی سے باہر آتیں اور سرد مہری سے نکلی چلی جاتیں اور سپاہی اسی انداز سے بندوق کاندھے پر رکھے ٹہلتا رہتا اور لکڑی کی طرح ساکت ہو جاتا۔

یہ پہرہ امتحانوں کے زمانے تک رہا تھا، پھر چھٹیاں آ گئی تھیں۔ کالج بند ہو گیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اب یہ واقعہ ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گیا ہے۔ جن طلبا نے اس ہنگامے میں زور شور سے حصہ لیا تھا۔ وہ کالج سے رخصت ہو کر اب زندگی کے ہنگاموں میں مصروف ہو چکے ہیں۔ شاید انہیں یہ واقعہ کبھی یاد بھی نہ آتا ہو لیکن اس درخت پر اس واقعہ کا اثر گہرا پڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہرے درخت کو نہیں کاٹنا چاہئے، اس سے بربادی آتی ہے۔ اس درخت کی ہری بھری شاخوں اور گدوں کے کٹنے سے کالج میں کوئی بربادی نہیں آئی۔ وہ تو اور ترقی کر رہا ہے ہاں یہ درخت ہی ویران ہو گیا۔ ایک خشک سا تنا، دو تین ٹیڑھے میڑھے گدے۔ ان گدوں پہ پتے تو بس اب برائے نام ہی ہیں اور یہ پتے بھی سوکھے بدرنگ سے ہیں۔

باروں مہینے ایک پت جھڑ کی کیفت رہتی ہے۔ پتوں اور ٹہنیوں سے محروم ایک گدا عجب ٹیڑھ میڑھ سے فضا بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ درخت سے دامن چھڑا کر خلا میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ ایک دوسرا گدا اک ذرا ترچھا ہو کر آسمان کی طرف اٹھتا چلا گیا ہے۔ صرف اس کی پھننگ پہ پتوں کا ایک گچھا ہے۔ باقی وہ خشک لکڑی ہے جس میں اکا دکا ٹہنیاں ہیں اور ان ٹہنیوں میں دو دو چار پتے لگے ہیں۔ اس کے نیچے والا نل مدتوں سے خشک پڑا ہے۔ اس کا ہتھا ٹوٹ کر نیچے لٹک گیا ہے۔ آم کے زرد خشک پتے، اکا دکا کتاب کا ورق، کوئی گھسی گھسائی ٹوٹی پھوٹی پنسل، ایک دو کپڑوں کے چیتھڑے---- یہ اس نل کے کھرے کی پونجی ہے۔ کبھی کبھی جب دوپہر کو زور کی ہوا چلتی ہے تو یہ کچرا سمٹ کر نالی کے خشک سوتے پہ جمع ہو جاتا ہے۔ لڑکے مختلف روشوں پر گھومتے ہیں اور بالعموم اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔ لڑکیاں اپنے کمرے سے نکل کر اسی راستے سے ہو کر کلاسوں میں جاتی ہیں۔ وہ بے اعتنائی سے گزری چلی جاتی ہیں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ان کے چہرے پہ سرخی نہیں دوڑتی نہ چال میں فرق آتا ہے اور نہ کسی بکھری ہوئی لٹ کو سنوارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سنتے ہیں کہ اس کالج کی عمارت کو اور وسیع کرنے کا منصوبہ ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ اس آم کے پیڑ کو یہاں سے کٹوا دیا جائے گا اور یہاں کامرس کی کلاسوں کے لئے کمرے تعمیر ہوں گے۔

☆......☆......☆

آخری موم بتی

ہماری پھوپھی جان کو تو بڑھاپے نے ایسے آ لیا جیسے قسمت کے ماروں کو بیٹھے بٹھائے مرض آ دبوچتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بعض لوگ اچانک کیسے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ آندھی دھاندھی جوانی آتی ہے' بڑھاپا تو دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر آیا کرتا ہے لیکن پھوپھی جان بوڑھی نہیں ہوئیں بڑھاپے نے انہیں آناً فاناً آن دبوچا۔ جوانی' جوانی سے بڑھاپا۔ ہم جس وقت وہاں سے چلے ہیں تو اس وقت وہ اچھی خاصی تھیں' گوری چٹی' کالے کالے چمکیلے گھنے بال گٹھا ہوا دوہرا بدن' بھری بھری کلائیوں میں شیشے کی چوڑیاں' پنڈلیوں میں تنگ پائجامے کا یہ حال کہ اب مسکا' لباس' انہوں نے ہمیشہ اجلا پہنا' وصلی کی جوتیاں بھی زیادہ پرانی نہیں ہو پاتی تھیں کہ بدل جاتیں تھیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئی جوتی کی ایڑی دوسرے تیسرے دن ہی بیٹھ جاتی تھی۔ بے تحاشا پان کھاتی تھیں اور بے تحاشا باتیں کرتی تھیں۔ محلے کی لڑنے والیوں میں صف اول میں ان کا شمار تھا۔ لڑنے پہ تو بس ادھار کھائے بیٹھی رہتی تھیں اور ادھار انہیں خوب ملتا تھا' ذرا سی بات ہوئی اور بکھر پڑیں۔ طبیعت میں رنگینی تھی لیکن نہ ایسی کہ اچھال چھکا کہلائیں۔ بس یہی تھا کہ کھل کر بات کرتی تھیں اور بے ساختہ ہنستی تھیں۔ ہاں میں ایک بات اور بتاتا چلوں۔ پھوپھی جان میری سگی پھوپھی نہیں ہیں۔ اپنی والدہ کا بیان اگر مجھے غلط یاد نہیں ہے تو وہ میرے مرحوم والد کے چچا زاد...... یا خالہ زاد...... یا شاید پھوپھی زاد بھائی کی بیٹی ہیں۔ ہمارے خاندان میں سب چھوٹے انہیں پھوپھی جان ہی کہتے ہیں اور شاید میری طرح کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ان سے ان کا کیا رشتہ ہے۔ ویسے خاندان میں سب ان کا پاس بھی کرتے ہیں اور ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ فسادات کے ماروں کی گنوردل کے ساتھ ساتھ ہم چلنے لگے تو پھوپھی جان سے خاندان کے ایک ایک شخص نے

اصرار کیا کہ پاکستان چلی چلو۔ ان کے دماغ میں تو یہ سما گئی تھی کہ اگر وہ چلی گئیں تو امام باڑے میں تالا پڑ جائے گا۔ خیر' یہ بات ٹھیک ہی ہے۔ عزاداری کی ساری ذمہ داری اب تو ان کے سر ہے ہی لیکن پہلے بھی اس کا انتظام وہ ہی کرتی تھیں۔ دراصل ہمارا جدی امام باڑہ اس گھر کا حصہ ہے جہاں پھوپھی جان رہتی ہیں۔ محرم کے دنوں میں امام باڑے میں عزاداری ہوتی تھی اور پھوپھی جان کے گھر میں مہمانی' خاندان کے جو لوگ سرکاری ملازمتوں پر قریب و دور کے شہروں میں گئے ہوتے تھے ان دنوں ضرور یہاں کا پھیرا لگاتے تھے اور جس کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہ ملتی تھی وہ پھوپھی جان کے ہاں جا کر ڈیرے ڈال دیتا تھا۔ ہاں میرے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں ان کے گھر جا کر ٹھہرا۔ بات یہ ہے کہ میری خالائیں اور مامیاں اتنی تھیں کہ مجھے یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا تھا کہ کس کے یہاں جا کر ٹھہروں۔ جس کے نہ ٹھہرو اس کے برے بنو۔ میں نے تو تنگ آ کر یہ دعا مانگنی شروع کر دی تھی کہ اللہ میاں میری خالاؤں' مامیوں اور چاچیوں کی تعداد میں تھوڑی سی کمی کر دے۔ وہ کم تو نہ ہوئیں' تتر بتر ہو گئیں۔ بہرحال دعا قبول ہوئی لیکن مسئلہ پھر بھی جہاں کا تہاں رہا۔ مجھے یہاں سے چلتے وقت ایک مرتبہ پھر یہ سوچنا پڑا کہ ٹھہرنا کہاں ہے اور اس دفعہ سوائے پھوپھی جان کے گھر کے اور کوئی ٹھکانا ہی ذہن میں نہ آیا۔ ابھی کیا کہہ رہا تھا کہ پھوپھی جان بوڑھی ہو گئی ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر چکرا سا گیا۔ بالکل ڈھل گئی ہیں۔ بال کھچڑی' چہرے پر جھریاں' نیچے کے دو دانت جھڑ گئے ہیں' سفید دوپٹہ اور ننگی کلائیاں تو خیر رنڈاپے کے طفیل ہیں ورنہ پہلے تو وہ رنگا چنا دوپٹہ اوڑھے رہا کرتی تھیں اور شیشے کی رنگین پھنسی پھنسی چوڑیاں ان کی کلائیوں میں کھنکھنایا کرتی تھیں۔ سروطہ پہ مجھے یاد آیا کہ پھوپھی جان کا پان چھالیا کا خرچ اب بہت کم ہو گیا ہے۔ ان کے گھر بیبیوں کا وہ جھمگٹا بھی تو نہیں رہتا۔ پان چھالیا کا خرچ آپ سے آپ کم ہو گا۔ ان کا سروطہ بھی کم چلتا ہے اور زبان بھی کم چلتی ہے۔

میں ہنس کے کہنے لگا۔ ''پھوپھی جان آپ تو بالکل ہی بدل گئیں۔ کسی سے اب لڑائی بھی نہیں ہوتی''

پھوپھی جان تو کچھ نہ بولیں۔ ان کے نہ بولنے پہ بھی مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ ہاں شمیم بول اٹھی۔ ''لڑیں کس سے بھنڈیلیاں تو پاکستان چلی گئیں۔''

شمیم سچ کہتی تھی۔ اب تو اڑوس پڑوس میں شرنارتھی نظر آتے ہیں۔ برابر کے مکان میں پہلے پنڈ راول والی رہتی تھی۔ پھوپھی جان کی یا تو اس سے لڑائی ٹھنی رہتی یا گاڑھی چھنتی تھی۔ اب وہاں ایک سردارنی رہتی ہے۔ اس سے پھوپھی جان یوں بھی اک ذرا دب کر بات کرتی ہیں۔ پھر بڑی دقت یہ ہے کہ سردارنی ٹھیٹھ پنجابی بولتی ہے اور پھوپھی جان اردو محاورے سے انحراف نہیں کرتیں۔ کبھی کبھی حق ہمسائیگی ادا کرتے ہوئے سردارنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتی ہے اور پھوپھی جان ایک آدھ لفظ پنجابی کا بھی استعمال کر لیتی ہیں لیکن یہ تو سمجھوتے کی بات ہوئی اور لڑائی سمجھوتوں سے نہیں لڑی جاتی۔ سردارنی کا جسم ڈھل گیا ہے لیکن لو اب تک دیتا ہے عجیب بات ہے کہ سردارنی کے لونڈے کو یہ چمک دمک ذرا بھی ورثہ میں نہیں ملی ہے۔ وہ گورا چٹا ضرور ہے' مٹی میں بھی نہیں کھیلتا' لیکن اس کے چہرے پر وہ شادابی پھر بھی نظر نہیں آتی جو اس عمر کے بچوں کے چہرے پر کھیلتی نظر آیا کرتی ہے۔ شاید یہ شادابی اور چمک دمک کا سارا قصہ مٹی ہی کا قصہ ہو۔ سردارنی کا بچہ اس مٹی کی بو باس سے غالباً ابھی مانوس نہیں ہوا ہے۔

ویسے یہ مانوس اور نامانوس کا سوال ہے ٹیڑھا۔ اب میں ہی ہوں مجھے یہ محلہ مانوس بھی نظر آتا ہے اور اجنبیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اصل میں اپنے محلے کا رنگ ڈھنگ عجیب ڈھب سے بدلا ہے۔ اس کے قصے سے نیندیں نہ اڑیں مگر ہے وہ عجب طور ہی کی کہانی۔ پہلی نظر میں تو تبدیلی کا احساس خود مجھے بھی نہیں ہوا تھا۔ میں منہ اندھیرے گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے بھی عجیب بات ہی کہنا چاہیے کہ دنیا بدل گئی' ہمارے محلے کا بلکہ ہمارے پورے نگر کا طور بدل گیا۔ لیکن ریل کا وقت اب بھی وہی ہے۔ ریل اب بھی وہاں تڑکے پہنچتی ہے۔ ریل کا وقت نہیں بدلا اور اسٹیشن والی سڑک نہیں بدلی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے دونوں کو ایک ہی وضع پہ دیکھا اور اب بھی دونوں کی وہی وضع نظر آئی۔ سڑک خستہ پہلے ہی تھی' اب اور خستہ ہو گئی ہے۔ کئی مرتبہ تو یہ ہوا کہ یہ پتہ نہ چلا کہ اکہ آگے بڑھ رہا ہے یا پیچھے ہٹ رہا ہے۔ سامنے کئی اِکے اور بھی چلے جا رہے تھے۔ صبح کے دھندلکے اور اڑتی ہوئی گرد میں وہ بھی بس یوں نظر آتے تھے کہ چل نہیں رہے ہیں بلکہ چرخ کھا رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہموار سڑک آ جاتی اور سب اِکے پوری رفتار سے دوڑنے لگتے۔ ان کے پہیوں کے شور سے بہنگم اور میٹھا میٹھا ترنم پیدا ہوتا اور پوری فضا

پہ چھا جاتا۔ پھر پہیہ اچانک دھم سے کسی گڑھے میں گر جاتا اور یوں معلوم ہوتا کہ اِکہ اب الٹا اور اب الٹا۔ سڑک سے ہٹ کر ٹیلی گراف کے تار پر ایک شاما چڑیا اس کیفیت سے اپنی ننھی سی دم کو گردش دے رہی تھی گویا اس میں کسی نے پارہ بھر دیا ہے۔ لبِ سڑک ایک شیشم کا گھنا پیڑ کھڑا تھا جس کے سارے پتے چڑیوں کے مٹھاس بھرے شور سے گونج رہے تھے۔ لیکن چڑیا کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اِکہ پھر تیزی سے چلنے لگا۔ مٹھاس بھرا شور دھیما پڑتا گیا۔ دھیما پڑتا گیا اور صبح کے اُمنڈتے ہوئے دھیمے راگ میں مل گیا۔ ہوا میں ایک مہک پیدا ہو چلی تھی۔ سڑک سے لگی ہوئی مٹھن لال کی بغیچی تھی جہاں بیلا چنبیلی کے درخت سفید سفید پھولوں سے لدے کھڑے تھے ان سے ورے ایک نیم تلے رہٹ چل رہی تھی۔ چبوترے پہ لالہ مٹھن لال کھڑے تھے۔ ننگے پیر' ننگے سر' بدن پہ لباس کے نام ایک بدرنگ دھوتی' گلے میں سفید ڈورا' ایک ہاتھ میں پیتل کی گڑھی' دوسرے میں نیم کی دتون لالہ مٹھن لالہ کے طور اطوار میں ذرا بھی تو فرق نہیں آیا ہے۔ اسی انداز سے سویرے منہ اندھیرے ٹٹی اور اشنان کو گھر سے نکل بغیچی پہنچتے ہیں۔ جنگل سے واپسی پر رہٹ پہ بیٹھ کر پیلی مٹی سے گڑھی مانجھتے ہیں۔ نیم کی دتون کرتے ہیں اور جتنی دتون کرتے ہیں' اتنا ہی تھوکتے ہیں۔ لالہ مٹھن لال کی بغیچی سے بس ذرا آگے بڑھ کر آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ بازار ابھی بند تھا۔ ہاں موتی حلوائی کی دکان کھل گئی تھی لیکن چولہا ابھی گرم نہیں ہوا تھا۔ جلیبیوں اور کچوریوں کے ابتدائی انتظامات ہو رہے تھے۔ دکان کے سامنے جھوٹے دونوں' کلھڑوں اور الا بلا کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ جس پہ ایک دو کتے بڑی بیدلی سے منڈلا رہے تھے۔ مہتروں نے جھاڑو کا سلسلہ ابھی بند نہیں کیا تھا۔ سڑک پہ جا بجا گرد اڑ رہی تھی اور اپنی گلی کی نکڑ پہ تو اتنی گرد تھی کہ تھوڑی دیر تک کچھ نظر ہی نہ آیا۔ بس ایک دھندلا سا سایہ حرکت کرتا دکھائی دیتا تھا ۔ اِکہ جب بالکل قریب پہنچ گیا تب مجھے پتہ چلا کہ یہ جھالو مہترانی ہے۔ اس نے مجھے بڑی رعونت سے دیکھا اور پھر جھاڑو دینے میں مصروف ہو گئی۔ مجھے اس کی رعونت پہ پانچ چھ سال پہلے والا زمانہ یاد آ گیا۔ میں اور وحید اکثر علی گڑھ سے اسی گاڑی سے آیا کرتے تھے اور ہر مرتبہ جھالو مہترانی اسی انداز سے جھاڑو دیتی نظر آتی۔ رعونت سے ہمیں دیکھتی اور پھر جھاڑو دینے لگتی۔
وحید آج کل کراچی میں ہے لیکن کراچی جا کر اس نے تو ایسا چولا بدلا کہ ٹھیٹھ پاکستانی نظر آتا ہے۔ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے اور گلچھرے اڑاتا ہے۔ پچھلے سال اتفاقاً اس سے

ملاقات ہو گئی تھی۔ بڑی گرمی میں باتیں کرتا تھا۔ کراچی کی رونق کے قصیدے' تجارت کی نیرنگیوں کا احوال وہ کہتا رہا' میں سنتا رہا۔ اس کے نئے رنگ کو دیکھ کر میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ موٹر کی سواری پر منحصر نہیں' وحید کا تو پہلا چولا ہی بدل گیا ہے۔ امریکی طرز کی بشرٹ اور پینٹ تو ظاہری ٹھاٹ باٹ ہوئے' اس کا تو بات کرنے کا لہجہ تک بدل گیا ہے۔ بندرگاہ کراچی کی ہوا کی تاثیر سے میں ناواقف نہیں ہوں وہاں مہاجر اسی طرح چولا بدلتا ہے۔ وہ یا تو کسی فٹ پاتھ پہ ڈیرا ڈال دیتا ہے اور سمندر کی نم ہواؤں کے سہارے جیتا ہے یا پھر چھیلا بن کر موٹروں میں گھومتا ہے لیکن وحید کی نئی وضع قطع دیکھ کر مجھے واقعی بہت تعجب ہوتا ہے میرا یہ عقیدہ رہا تھا کہ جسے علی گڑھ نہیں بگاڑ سکتا اسے دنیا کی کوئی برائی نہیں بگاڑ سکتی۔ میں اور وہ علی گڑھ ایک سال کے فرق سے پہنچے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ میں میٹرک میں ایک سال لڑھک گیا تھا ایک سال بعد جب میں علی گڑھ پہنچا تو وحید میں مجھے ذرا بھی تبدیلی نظر نہ آئی۔ ایک میلی کالی اچکن کے سوا اور کوئی نئی چیز اسے علی گڑھ سے تحفے میں نہیں ملی تھی۔ اب بھی اسی محنت' اسی ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ وحید کو ہماری پھوپھی جان ہی نے پڑھایا لکھایا ہے۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ وحید کی شمیم سے منگنی ہو گئی تھی اسے معمولی منگنی بھی نہیں کہنا چاہیے۔ یوں اب مجھے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے پھر بھی یہی کہوں گا کہ کمبخت کو شمیم سے عشق تھا۔ اس لئے میری دلیل یہ ہے کہ اگر معمولی لگاؤ ہوتا تو علی گڑھ میں جا کر اس کا زور ٹوٹ جاتا۔ علی گڑھ میں یاروں کا عجب طور تھا۔ جس لڑکے نے امتحان سے ڈیڑھ دو مہینے کسی لڑکی کو ٹیوشن پڑھا دیا اس نے اپنی لگاوٹ کا اعلان کر دیا۔ جو لڑکا کسی نئے طالب علم کے ساتھ تین دن میرس روڈ پر گھوم لیا اس کی عشق کی خبر مشتہر ہو گئی۔ علی گڑھ میں عشق کم' عشق کا چرچا زیادہ تھا لیکن وحید نے لڑکیوں کے ٹیوشن کیے اور مسلسل کیے لیکن اپنی آن قائم رکھی۔ ہفتے کی چھٹی آئی اور وہ علی گڑھ سے رسہ تڑا کر بھاگا۔ ادھر شمیم بھی شاید اس کی باٹ ہی دیکھتی رہتی تھی۔ میں تو جب بھی وحید کے ساتھ گیا اس گلی سے گزرتے وقت یہی دیکھا کہ اوپر کی کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے شمیم اتنی حسین وجمیل تو نہ تھی کہ اسے حور اور پری کہا جائے لیکن اس میں ایک عجیب سی کشش ضرور تھی۔ چھریرا بدن' لمبا قد' کھلتا ہوا رنگ' آنکھیں...... مجھے ان آنکھوں کا ذکر ذرا زیادہ جوش سے کرنا چاہیے۔ اگر اس کی آنکھیں ایسی نہ ہوتیں تو وہ معمولی شکل وصورت والی لڑکیوں میں شمار ہوتی شعر اور افسانہ قسم کی چیزوں سے مجھے

چونکہ کوئی ربط نہیں ہے۔ اس لئے میرے ذہن میں کوئی خوبصورت تشبیہ نہیں آ رہی۔ بس کچھ ایسا تاثر پیدا ہوتا تھا کہ کیوڑے سے بھری ہوئی دو پیالیاں ہیں جو چھلک جانے کو ہیں۔ اس کی پتلیاں گردش کرتی ہوئی نہیں بلکہ تیرتی نظر آتی تھیں۔ میں نے اسے کئی مرتبہ شلوار پہنے بھی دیکھا ہے لیکن شلوار تو وہ شوقیہ پہن لیا کرتی تھی اس کا روزمرہ کا لباس ڈھیلا پائجامہ تھا اور واقعہ ہے کہ ڈھیلا پائجامہ' اس کے چھریرے بدن اور لمبے قد پہ خوب پھبتا تھا۔ پھولوں کی بڑی شوقین تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں جب بھی پھوپھی جان کے گیا یہی دیکھا کہ شمیم بیٹھی بیلے کے پھول گو رہی ہے جتنے پھول کانوں میں پہن سکتی تھی کانوں میں پہن لیتی تھی۔ باقی کے گجرے پرو کر کورے کورے گھڑوں پہ پھیلا دیتی تھی۔

میں نے اگر ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے تو اس سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ شمیم زندہ ہے۔ اصل بات یوں ہے کہ مجھے اپنا پورا محلہ ہی ماضی کا صیغہ نظر آتا ہے اب شمیم کو میں اس سے کیسے علیحدہ سمجھوں اور پھر اب شمیم میں وہ بات بھی نہیں رہی۔ اس میں جو ایک عجب قسم کی لہک تھی اس نے دھیمی دھیمی حزینہ کیفیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ شمیم اب خاصی جھٹک گئی ہے۔ اس کا چھریرا جسم کچھ اور زیادہ چھریرا نظر آنے لگا ہے۔ چہرہ بھی سونت گیا ہے اور اس کی آنکھوں کی شادابی سے وہ کیوڑے والی کیفیت اب پیدا نہیں ہوتی' یہ الگ بات ہے کہ اس کے جسم کی مہک کم نہیں ہوئی ہے اس کی آنکھوں سے اب کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے میں اس کے لئے ''افسردگی'' کا لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ اس کی آنکھوں کی اس نئی کیفیت کے سلسلے میں مجھے یہ لفظ کچھ عامیانہ سا نظر آتا ہے لیکن کیا ضرور ہے کہ میں کوئی ترشا ترشایا لفظ استعمال ہی کروں۔ دراصل اس گھر کی پوری فضا میں ہی اب ایک عجیب سی کیفیت رچ گئی ہے جسے میں لفظوں میں ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا۔ پھوپھا کا انتقال ہمارے جانے کے تھوڑے ہی دن بعد ہوا تھا۔ شاید اس گھر کا طور اسی وجہ سے بدل گیا ہے۔ ہمارے پھوپھا اچھے زمیندار تھے۔ ان کے زمانے میں گھر میں ترکاریوں کی وہ ریل پیل رہتی تھی کہ پھوپھی جان محلے والیوں پہ خوب عنایت کرتی تھیں اور پھر بھی ترکاری بہت سی سوکھ جاتی تھی۔ خربوزوں کی فصل پہ یہ عالم ہوتا کہ پھوپھی جان کے گھر کا آنگن بستی ہو جاتا اور ادھر مینہ کا چھینٹا پڑا' ادھر خربوزوں کی آمد بند اور آموں کے ٹوکروں کی آمد شروع۔ بوندا باندی کا عالم

ہے' صحن میں پانی سے بھری ٹب رکھی ہے اور اس میں آم پڑے ہیں لیکن اب تو پھوپھی جان کے آنگن میں جھاڑو سی دلی رہتی ہے نہ خربوزوں کے چھلکے نظر آتے ہیں' نہ آموں کی گٹھلیاں دکھائی دیتی ہیں' نہ گوبھی اور مولی کے پتے بکھرے ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت پھولوں کے آنے کا دستور بھی بند ہو گیا ہے۔ شمیم کے کانوں میں بس دو ہلکے پھلکے روپہلی بندے ہلکورے کھاتے رہتے ہیں۔ پھوپھی جان کے لباس میں تو خیر نمایاں فرق پیدا ہو ہی گیا ہے لیکن شمیم بھی اب اتنی اجلی نہیں رہتی۔ اس تبدیلی سے قطع نظر مجھے تو شمیم کو وہاں دیکھ کر ہی تعجب سا ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ شمیم کی شادی ہو گئی ہے اور وحید کے ساتھ کراچی میں ہے میں یہی تصور کر لیتا کہ شمیم کراچی سے آئی ہوئی ہے مگر اس کے چہرے پہ بھی تو اس آسودگی کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا جو شادی کے بعد لڑکیوں کے چہروں پر پیدا ہو جاتا کرتی ہے۔

میں نے موقعہ پا کر بات چھیڑ ہی دی۔ ''پھوپھی جان وحید تو آج کل کراچی میں ہے ناں؟''

پھوپھی جان اس وقت گیہوں صاف کر رہی تھیں۔ صحن میں چھوٹا سا ٹاٹ بچھا تھا۔ اس پہ گیہوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا اور پھوپھی جان چھاج میں تھوڑے تھوڑے گیہوں ڈال کر پھٹکتیں اور الگ ایک ڈھیر لگاتی جاتیں میرے فقرے کا ان پر کوئی شدید ردعمل تو نہیں ہوا' وہ اسی طرح کنکریاں بینتی رہیں۔ ہاں لہجے میں فرق ضرور پڑ گیا تھا۔ لہجے کی یہ کیفیت غصے اور افسردگی کے بین بین تھی۔ کہنے لگیں ''خاک ڈالو کم بخت پہ۔ ہماری بلا سے وہ کہیں ہو۔''

میں اور چکرایا۔ پہلے تو میں چپ رہا کہ پھوپھی جان خود ہی کھلیں گی لیکن وہ تو اسی طرح گیہوں کے ڈھیر پر جھکی رہیں۔ پھر میں نے ہی بات چلائی۔ ''تو شمیم......''

پھوپھی جان میری بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ ''ارے بھیا! اس نے تو کرانچی جا کر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ کوئی چلتی پھرتی مل گئی اس سے بیاہ کر لیا'' انہوں نے چھاج اٹھایا اور آہستہ سے دو دفعہ گیہوں پھٹک کر پھر کنکریاں بینی شروع کر دیں۔ کنکریاں بینتے بینتے اسی طرح چھاج پہ نظریں جمائے ہوئے وہ پھر بولیں۔ ''ڈوبا ہمارا تو لہنا ہی ایسا ہے۔ مٹے کو پڑھایا لکھایا پالا پرورش کیا اور اس نے ہمارے ساتھ یہ دغا کی...... یاں سے کہہ گیا کہ کرانچی جاتے ہی خط بھیجوں گا لے بھیا اس نے تو واں جا کے ایسی کینچلی بدلی۔ دنیا بھر کے فیل کرنے لگا۔''

پھوپھی جان چپ ہوگئیں ان کی نظریں اسی طرح گیہوں کی ڈھیری پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈھیری کے دانوں کو آہستہ آہستہ پھیلاتیں اور کریدتیں اور کنکریاں چن کے ایک طرف پھینکتی جاتیں۔ کنکریاں چنتے چنتے وہ پھر آہستہ سے ٹھنڈا سا سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ ''خیر ہم نے جیسا کیا ہمارے آگے آئے گا'' اور انہوں نے چھاج میں گیہوں ڈالے اور زور سے پھٹکنے شروع کر دیئے۔ ''کمبخت گیہوں میں نرا کوڑا ہے' آدھے جو ملے ہوئے ہیں'' اور انہوں نے اور زور سے گیہوں پھٹکنے شروع کر دیئے۔

میرا وہاں ایک ہفتے قیام رہا مگر پھر کبھی یہ ذکر نہیں نکلا۔ دکھتے ہوئے گھاؤ پہ ایک مرتبہ میں انگلی رکھ چکا تھا۔ دوبارہ اتنی جرأت نہ ہوئی پھوپھی جان نے خود یہ ذکر چھیڑا نہیں مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اسے بھول بسر گئی ہوں۔ ان کی چپ چپ' ان کے پورے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ پھوڑا ہر وقت دکھتا ہے' درد کرتا ہے۔ شمیم اس حد تک تو متاثر نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن ایک دھیمے' نیم محسوس دکھ کی کیفیت تو اس کی چال ڈھال سے بھی پیدا ہوتی تھی۔ اس گھر کی چہل پہل نہ جانے کہاں رخصت ہوگئی تھی۔ گھر میں سارے دن خاموشی چھائی رہتی۔ باتیں ہوتیں تو خاموشی کا تاثر اور گہرا ہو جاتا۔ پھوپھی جان اکثر بے معنی طور پر باورچی خانے میں صحن میں اور صحن سے کسی کمرے میں جاتیں اور خواہ مخواہ کی مصروفیتیں پیدا کرتیں اور یوں معلوم ہوتا کہ یہ پھوپھی جان نہیں ہیں' پھوپھی جان کا سایہ اس گھر پہ منڈلا رہا ہے۔ مجھے خفقان ہونے لگتا اور میں باہر نکل جاتا۔ باہر گلی میں شرنارتھیوں کے سائے چلتے پھرتے نظر آتے اور خاموش گلی بدستور خاموش رہتی۔

اسے پرمٹ سسٹم کی ستم ظریفی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ویسے میں اسے اتفاق ہی کہوں گا کہ وہاں سے میری روانگی ٹھیک یکم محرم کو ہوئی۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے پچھلے سال چاند ۲۹ کا ہوا تھا ۲۹ کو سارے دن پھوپھی جان اور شمیم امام باڑے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہیں۔ شمیم کو مجلسوں' زیارتوں اور نوحے مرثیے سے پہلے بھی بڑا لگاؤ تھا لیکن اب تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو عزاداری ہی کیلئے وقف کر دیا ہے۔ کس انہماک سے وہ سارے کام کر رہی تھی۔ پھوپھی جان نے تو بس واجبی واجبی کام کیا۔ باقی امام باڑے کو پوتنے علموں کے دھونے' پاک کرنے' سجانے اور جھاڑ فانوس کے جھاڑنے صاف کرنے کے سارے کام شمیم ہی

نے کیے۔ میں حیران رہ گیا۔ اس کام میں نہ جانے کون کون پھوپھی جان کا ہاتھ بٹاتا تھا اور آج سارا کام شمیم کر رہی تھی۔

میں تیسرے پہر باہر نکل گیا۔ قدم خواہ مخواہ اسٹیشن کی طرف اٹھ گئے پلیٹ فارم پہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پٹڑی کے درے درختوں پہ کہیں کہیں مرجھائی ہوئی دھوپ پھیلی دکھائی دیتی تھی ایک درخت پہ بہت سے کوے بیٹھے تھے جو مسلسل شور کیے چلے جا رہے تھے کبھی کبھی کوئی کوا گھبراہٹ کے عالم میں شاخوں سے نکل کر فضا میں بلند ہوتا اور بیٹھے ہوئے کوؤں کی مزاحمت کے باوجود پھر اسی شاخ پر بیٹھنے کی کوشش کرتا اور کامیاب رہتا۔ مجھے خیال آیا کہ آج غالباً چاندرات ہو جائے۔ محرم کی تقریب سے لوگوں کو آنا چاہیے' پہلے تو ہر سال یہی ہوتا تھا کہ چاندرات ہوئی۔ پردیس میں گئے ہوئے لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ اتنی دیر میں ریل کے آنے کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر کیلئے پلیٹ فارم کی خاموش فضا میں ایک گہما گہمی پیدا ہوگئی۔ گاڑی آئی' چند منٹ ٹھہری' آنے والے اترے' جانے والے سوار ہوئے' جانی پہچانی صورت براجنے والوں میں دکھائی دی نہ سدھارنے والوں میں۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔ پلیٹ فارم خالی ہونے لگا۔ میں پلیٹ فارم سے باہر نکل کر گھر کی طرف ہولیا۔

شام ہو چلی تھی۔ دن کا اُجالا مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ تاشوں کی آواز نے گلی کی فضا میں ہلکی سی گرمی پیدا کر دی تھی۔ کلو اور شرافت تاشہ بجا رہے تھے۔ کلو جوتے بنانے کا کام کرتا ہے اور شرافت آج کل چونگی کی چوکی پہ منشی لگا ہوا ہے۔ بر میں سیہ قمیض' گلے میں تاشے ہاتھوں میں قمچیاں' تیسرا تاشہ شرافت کے چھوٹے بھائی کے گلے میں تھا۔ مگر اس کی قمچی بار بار غلط پڑتی تھی اور تاشے کی بنی بنائی گت بگڑ جاتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تاشہ بجنا شروع ہوا ہے۔ گھر سے اور لوگ نکلیں گے کسی کے گلے میں تاشہ ہوگا' کوئی محض دیکھنے والا ہوگا اور پھر ایک لمبا جلوس بن جائے گا جو گلیوں اور محلوں میں گشت کرتا ہوا سارے امام باڑوں میں پہنچے گا اور محرم کی آمد کا اعلان کرے گا۔ ہر سال یہی ہوا کرتا تھا۔ مگر بہت دیر ہوگئی اور سوائے چند بچوں کے اس مختصر گروہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ایک بڑے میاں کہیں سے باہر لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ رہے تھے۔ تاشوں کو سن کر رکے' پوچھا۔ ''بھائی محرم کا چاند ہو گیا؟''

''ہاں جی دیکھ گیا۔'' ایک چھوٹے سے لڑکے نے جواب دیا۔

بڑے میاں نے عینک ماتھے پر بلند کی' چند منٹ تاشے والوں کو تکتے رہے اور پھر لاٹھی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور گھر میں داخل ہو گئے۔

رفتہ رفتہ کلو اور شرافت کے ہاتھ دھیمے پڑ گئے۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ آگے آگے شرافت اور کلو پیچھے چند بچے اور یہ جلوس گلی سے نکل کر کسی دوسری طرف مڑ گیا۔ گلی میں پھر خاموشی چھا گئی۔

میں جب گھر میں داخل ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ امام باڑے میں روشنی ہو رہی تھی۔ جھاڑ فانوس اپنے اسی پرانے اہتمام سے جگر جگر کر رہے تھے۔ فرش پہ جا جم بچھی تھی۔ جس پہ جا بجا سوراخ پڑے تھے۔ منبر پر چڑھا ہوا سیہ غلاف بھی خاصا بوسیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے بائیں سمت جو قالین بچھا ہوا تھا وہ بوسیدہ تو نہیں میلا ضرور ہو گیا تھا۔ شمیم اگر بتیاں جلا جلا کر طاقوں کے سوراخوں میں اڑس رہی تھی۔ سر سے پیر تک سیہ لباس پہن رکھا تھا' سیہ ڈھیلا پائجامہ' سیہ قمیص' سیہ جارجٹ کا دوپٹہ' شیشے کی نازک آسمانی چوڑیاں اتار دی تھیں' لیکن وہ روپہلی بندے اسی طرح کانوں میں لہرا رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے آواز دی۔ ''بھائی جان علموں کی زیارت کر لو۔''

دروازے میں جوتے اتار کر میں اندر داخل ہوا۔ علم اندر عزا خانے میں سجے ہوئے تھے جس کا دروازہ منبر کے برابر کھلتا ہے میں نے کالا پردہ اٹھایا اور اندر چلا گیا مجھے ایسا لگا کہ گیلی زمین پہ چل رہا ہوں۔ عزا خانے کا فرش کچا ہے۔ وہ آج ہی لیپا گیا تھا۔ وہاں اندھیرا تو نہیں تھا۔ چند ایک موم بتیاں طاقوں میں جل رہی تھیں۔ دو زرد سرخ موم بتیاں علموں کی چوکی پہ بھی جمی ہوئی تھیں لیکن ان کی روشنی کو اجالا تو نہیں کہا جا سکتا تھا علموں کی چوکی پہ موم بتیوں کے برابر مٹی کی پیالی میں لوبان سلگ رہا تھا' چوکی پہ ایک قطار میں علم سجے رکھے تھے۔ مختلف لمبائی کی چھڑیں' مختلف رنگ کے ٹپکے۔

مختلف دھاتوں کے مختلف شکلوں کے پنجے' کئی ایک علموں پہ پھولوں کے گجرے پڑے تھے' ایک سونے کا چھوٹا سا علم' سب سے زیادہ چمک رہا تھا۔ سونے کا پنجہ' سرخ ریشمی ململ کا ٹپکا' چنبیلی کے پھولوں کا نازک پتلا سا ہار' الگ ایک کونے میں لکڑی کا ایک کاجو بوجھو جھولا رکھا تھا۔ یہ جھولا چھ کی شب کو ہمارے امام باڑے سے نکلتا ہے سبز سرخ اور سیہ ٹپکوں میں لپٹے

ہوئے جگمگاتے ہوئے علم' موم بتیوں کی ہلکی دھیمی روشنی' لپی ہوئی گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو' لوبان سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا خوشبودار دھواں' ان سب چیزوں نے مل کر ایک تقدس کی فضا پیدا کر دی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت میرے حواس پہ چھاتی جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے علموں کی زیارت کی اور باہر جانے کیلئے مڑا لیکن شمیم نے ٹوک دیا۔ ''بھائی جان' دعا تو مانگ لیجئے۔''

اس وقت میرے جی میں نہ جانے کیا آئی۔ میں بے اختیار اس کے قریب پہنچ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''ان علموں نے جب تمہاری دعا قبول نہ کی تو میری دعا کیا قبول کریں گے۔''

شمیم ایک دم سے سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بھائی جان آپ تو بالکل وہابی ہو گئے۔''

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

عزا خانے سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شمیم منبر کے دوسری طرف ایک طاق پہ جھکی کھڑی ہے' پشت میری طرف ہے اور چہرہ تقریباً آدھا طاق کے اندر...... ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی موم بتی ہے غالباً اس کوشش میں ہے کہ موم کے گرم قطرے طاق میں ٹپکا کر ان پہ موم بتی کو جما دیا جائے۔ لیکن موم بتی کی گرم گرم بوندیں طاق پہ گرنے کی بجائے آہستہ آہستہ جا جم پہ گر رہی تھیں۔

امام باڑے سے میں آہستہ سے نکل آیا اوپر پہنچا تو شاید پھوپھی جان میرا انتظار کر رہی تھیں کہ فوراً ہی کھانا لا کے چن دیا۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور وہ برابر آ بیٹھی تھیں۔ اگر وہ اس وقت بہت چپ چپ تھیں تو اس میں میرے چونکنے کی ایسی کیا بات تھی۔ میں نے انہیں ان سات دنوں میں چہکتے کس دن دیکھا تھا جو ان کی خاموشی پہ چونکتا۔ میں نے دھیان نہیں دیا اور کھانے میں مصروف رہا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ پھوپھی جان گھٹنے پہ سر رکھے رو رہی ہیں۔

''پھوپھی جان کیا ہو گیا''؟ میں واقعی گھبرا گیا اور کھانا وانا سب بھول گیا۔

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولیں ''بھیا اب تمہارے امام باڑے میں تالا پڑے گا۔''

''آخر کیوں تالا پڑے گا' آپ جو یہاں ہیں؟''

''میں رانڈ دکھیا کیا کروں'' پھوپھی جان بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔

''مردانی مجلس بند ہوگئی' نہ کوئی انتظام کرنے والا تھا نہ کوئی مجلس میں آتا تھا...... اور بھیا برا ماننے کی بات نہیں ہے پاکستان والوں نے ایسا غضب کیا ہے کہ جب سے سکہ بدلا ہے کسی نے پھوٹی کوڑی جو محرموں کے لیے بھیجی ہو۔''

پھوپھی جان نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ ان کی رقت ختم ہوگئی تھی اب وہ سنبھلے ہوئے انداز میں باتیں کر رہی تھیں اگرچہ اس میں ہلکا ہلکا دکھ اب بھی جھلک رہا تھا۔ ''تمہارے پھوپھا زندہ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر اب تو خود ہمارا ہاتھ تنگ ہے۔ ہاتھ پیروں سے حاضر ہوں۔'' وہ ذرا چپ ہوئیں' ٹھنڈا سانس لیا اور بولیں۔ ''اب تو بھیا میرے ہاتھ پیر بھی تھک گئے۔ شمیم کا دم ہے کہ اتنا وتنا انتظام ہو جاوے ہے مگر شمیم ہمیشہ میرے پاس کوٹھے سے لگی تھوڑا ہی بیٹھی رہے گی......'' پھوپھی جان بات کرتے کرتے رک گئیں۔

وہ پھر کسی خیال میں کھوگئی تھیں۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ پھر بولیں' ان کی آواز اب اور دھیمی پڑ گئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کہہ رہی ہیں۔ ''جوان لونڈیا کو کب تک لیے بیٹھی رہوں' کوئی برا بھلا لڑکا ملے تو وہیں آ جاؤں گی' اور کیا کروں۔''

پھوپھی جان پھر اسی کیفیت میں کھوگئیں' میں کیا بولتا' چپ بیٹھا رہا' اتنے میں شمیم آ گئی اور وہ اتنے دبے پاؤں آئی تھی کہ مجھے آہٹ بھی تو نہ ہوئی۔ بس وہ اچانک آہستہ سے پھوپھی جان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ شاید وہ مجھ سے آنکھ بھی بچا رہی تھی۔ وہ آہستہ سے پھوپھی جان سے بولی ''امی جی بیبیاں آ گئیں۔ چل کے مجلس شروع کرا دیجئے'' اور اسی فقرے کے ساتھ ساتھ اس نے ایکا ایکی اڑتی سی نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کا رنگ اور گہرا ہوگیا تھا۔

صبح رخصت ہونا تھا صبح کی رخصت بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے سفر کی فکر میں رات بھر نیند نہیں آتی میں جلدی ہی سوگیا تھا لیکن بارہ بجے کے قریب پھر آنکھ کھل گئی۔ نیچے امام باڑے میں مجلس جاری تھی اور تو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک مصرعہ ضرور سنائی دے جاتا تھا۔

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں

کئی عورتیں مل کر پڑھ رہی تھیں لیکن شمیم کی آواز الگ پہچانی جاتی تھی' یہ مرثیہ وہ پہلے بھی بڑی خوش گلوئی سے پڑھتی تھی۔ اب اس کی آواز میں زیادہ سوز پیدا ہوگیا ہے' ایک غنودگی کی کیفیت پھر مجھ پہ چھاتی چلی گئی۔

میں نہ جانے کتنی دیر سویا' شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کیونکہ جب دوبارہ آنکھ کھلی ہے تو مجلس ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ہاں ختم ہو رہی تھی' کہیں بہت دور سے' شاید خواب کی وادی سے سوز میں ڈوبی ہوئی ایک نرم اور شیریں آواز آ رہی تھی۔

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں

آواز میں اب وہ اٹھان نہیں تھی وہ ڈوبتی جا رہی تھی' پھر وہ آہستگی سے خاموشی میں گھلتی چلی گئی۔ رات خاموش تھی ہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد زور سے کسی نوحے کی آواز ہوا کی لہروں کے ساتھ بہکتی ہوئی آ جاتی اور پھر کہیں کھو جاتی۔ البتہ تاشوں کی مدھم آواز مسلسل آ رہی تھی۔ شاید کسی امام باڑے میں ماتم ہو رہا تھا۔ نیچے ہمارے امام باڑے میں بھی سکوت ٹوٹ چکا تھا اور عورتوں کے آہستہ آہستہ ماتم کرنے اور آنسوؤں سے ڈھلی ہوئی مدھم آوازوں میں ''حسین حسین'' کا سلسلہ شروع ہو چلا تھا۔

☆......☆......☆

دیولا

دونوں وقت مل رہے تھے آسمان پہ اڑتی ہوئی ابابیلیں اب تھک تھکا کر تتر بتر ہو چلی تھیں۔ جھٹپٹے میں فضا یوں بھی پگھلنے سی لگتی ہے۔ اس لئے اگر گایوں کے گلوں میں گھنٹیاں باندھنے کا دستور نہ ہوتا تو بھی ایسا کیا فرق پڑتا۔ ان کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں ہی نہیں ان کے کھروں کی افسردہ مدھم چاپ بھی یہ کہتی نظر آتی تھی کہ بس اب یہ تھکا ماندہ قافلہ تھم جائے گا اور آہستہ آہستہ اُٹھتی ہوئی گئو دھول فضا میں معلق ہو کر رہ جائے گی۔ گایوں کی جھپیٹ سے بچنے کی غرض سے وہ سڑک کے کنارے کنارے ہولیا۔ صوفی جی کے گھر کے قریب تو اسے بالکل دیوار سے لگ کر چلنا پڑا تھا۔ صوفی جی کے دروازے کی چوکی پر ایک سرخ مرغا دیواروں سے بنتے ہوئے زاویے میں منہ دیئے چپ چاپ کھڑا تھا۔ شاید اسے اطمینان تھا کہ وہ آنے جانے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ مجو کے قدموں کی آہٹ سے وہ اس انداز سے چونکا جیسے کوئی چور کول لگاتا ہوا پکڑ لیا گیا ہو۔ مگر مجو کی بے اعتنائی نے اسے مطمئن کر دیا اور وہ پھر اسی استغنا سے اونگھنے لگا۔ مجو آگے بڑھ گیا۔ سفید کنکروں کی اس ٹوٹی پھوٹی اونچی نیچی سڑک پہ دھول مٹی کا راج بدستور قائم تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کنکروں کی وہ ڈھیریاں اسی طرح پڑی تھیں جس طرح وہ انہیں آج سے دو سال پہلے یہاں پڑا ہوا دیکھ کر گیا تھا۔ دھول مٹی میں اَٹی ہوئی اس بے ڈھنگی سڑک کے ٹیڑھے میڑھے زاویے، ککڑیا اینٹوں کی اونچی، نیچی دیواریں، مردان کبابی کی دکان پہ کڑوے تیل کا ٹمٹماتا ہوا دیا...... مجو کو یہ سب چیزیں نئی نئی سی نظر آئیں اور مانوس بھی۔ گرد و غبار کے غلاف میں لپٹی ہوئی یہ اُجلی اُجلی فضا تھی تو جانی پہچانی ہوئی لیکن ایک نئے انداز سے لو دے رہی تھی، نئے پن اور مانوسیت کی اس ملی جلی کیفیت پر وہ حیران بھی ہو رہا تھا اور خوشی سے اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ خوشی تو خیر ایک بندھی ٹکی چیز ہے، مگر حیرت

کا واقعی کوئی سر پیر نہیں ہوتا، حیرت اسے اس پر بھی ہوئی کہ مردان کبابی کی دکان کی بینچ کا چوتھا پایا ابھی بھی بالکل اسی طرح انہی تین موٹی اینٹوں کے سہارے کا محتاج تھا جو وہاں دو سال پہلے رکھی نظر آتی تھیں۔ متعجب وہ مردان کبابی پہ ہوا اور خلیفہ رحیم بخش پہ بھی۔ مردان کبابی پہ اس وجہ سے کہ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ اور خلیفہ رحیم بخش پہ اسی وجہ سے وہ کتنے بدل گئے تھے۔ مردان کبابی کے داڑھی کے بال جس حد تک پہلے کھچڑی تھے اسی حد تک اب بھی کھچڑی تھے۔ مجو نے گنتی نہیں گنی تھی۔ پھر بھی اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ داڑھی کا ایک بال بھی زائد سفید نہیں ہوا ہے داڑھی پہ ہی منحصر نہیں مردان کے جثے اور حلیئے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مردان تو دراصل اس قسم کے انسانوں میں سے تھا جن پہ ماہ و سال اثر انداز نہیں ہوتے۔ کتنے برس گزر جانے پر بھی اس کی شکل و صورت اور تن و توش بلکہ دکان کی کوئی بھی چیز نہیں بدلی تھی، مگر خلیفہ رحیم بخش۔ مجو انہیں اچھا خاصا چاق و چوبند چھوڑ کر گیا تھا۔ لیکن اب تو وہ سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔ کمر دوہری ہو گئی تھی اور بانہوں کا گوشت لٹکنے لگا تھا۔ پوری فضا اس کی ساری چیزیں کچھ بدلی بدلی سی بھی تھیں اور کچھ ٹھہری ٹھہری سی بھی، یہ تبدیلی اور ٹھہراؤ دونوں ہی حیران کن تھے۔ مجو کو وقت کے اثر اور بے اثری کا احساس مختلف شکلوں میں بیک وقت ہو رہا تھا۔ سامنے صوفی جی کے مکان کی دیوار پہ جب اس کی نظر پڑی تو اس پر کچھ اور عالم گزرا۔ اس نے غور سے ان فقروں کا جائزہ لیا۔ اس نے اسی دیوار پہ نہ جانے کتنے فقرے کس کس لڑکے کی شان میں لکھے تھے۔ لیکن اب تو ان میں سے کسی ایک فقرے کے آثار بھی باقی نہ تھے۔ اب وہاں کوئلے سے چند اور فقرے مختلف لڑکوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں لکھے ہوئے تھے جن میں محاورے اور روزمرہ کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا تھا۔ کوثر کی دھلی ہوئی اردو میں ایک فقرہ گول مول محلہ کے کسی ایک پری چہرہ شخص کی شان میں بھی رقم تھا۔ اسے یہ فقرے مطلق پسند نہ آئے۔ وہ افسردہ تو نہیں ہوا تھا لیکن تھی وہ کیفیت افسردگی سے ملتی جلتی۔ بڑی دقت یہ ہے کہ اتنی دھیمی کیفیتیں لفظوں کے جال میں بھی تو نہیں آتیں۔ مجو خود بھی کچھ زیادہ دیر اس کیفیت کے پھندے میں پھنسا ہوا نہیں رہا۔

بسنتی بھیا کو آوازیں دیتے دیتے دروازے پہ آ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ کسی اور ہی عالم میں پہنچ گیا۔ اس کے ذہن میں تو اس کا وہی پرانا نقشہ تھا۔ کانوں کی لوؤں میں نیم کا تنکا، میلی

ساڑھی، ننگے سر، ننگے پیر۔ ننگے پیر تو وہ اس وقت بھی تھی لیکن ساڑھی اُجلی تھی اور اس کا پلو سر پہ پڑا ہوا تھا۔ کانوں میں نیم کے تنکوں کی جگہ اب دو نازک سے سنہری بندے جگمگا رہے تھے۔ وہ اتنے تھوڑے دنوں میں کتنی لمبی ہو گئی تھی' اس کا بڑھتا ہوا قد' سینے کے ادھ کچرے ابھار' چہرے کا نکھرتا ہوا رنگ ان باتوں سے یہ پتہ تو چلتا تھا کہ بسنتی اب بڑی ہو چلی ہے وہ مجو کو دیکھ کر آواز دیتے دیتے چند لمحوں کیلئے رکی اور پھر اس نے اور زور سے آواز دی۔ ''چندی' ارے تو کو تاؤ بلاوے ہیں۔'' جب ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''نہ آتا تو مت آ' تو کو تاؤ بکیں گے'' اور یہ کہہ کے وہ جھٹ اندر چلی گئی۔

اُسے ابن جاتا دکھائی دیا۔ ابن تو بے دھیانی میں نکلا ہی چلا گیا تھا مگر مجو نے اسے دیکھتے ہی پکارا ''ابن'' اس نیم مانوس' نیم اجنبی آواز پر ابن چونکا۔ سامنے مجو کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو ابن حیرت سے کھڑا کا کھڑا رہ گیا' پھر لپک کر بولا ''ابے سالے مجو' تو آ گیا؟'' اور اسے اوپر سے نیچے تک تکتے ہوئے کہنے لگا ''تو تو بہت لمبا ہو گیا ہے بے' ادھر آئیو ذرا'' اس آخری فقرے کے ساتھ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لالٹین کے نیچے لے گیا جسے میونسپلٹی کا آدمی ابھی جلا کر گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجو کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اس کی نگاہیں ایک تحیر کی کیفیت کے ساتھ اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ ''ابے سالے تیری تو مونچھیں نکل آئی ہیں۔'' ابن ٹھیک کہتا تھا مجو کی مسیں واقعی بھیگ چلی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ چھپ کر اپنی آپا جی کی کپڑے کاٹنے کی قینچی سے مونچھوں کے اور ٹھوڑی کے اِکا دُکا بھورے بال تراش ڈالے تھے۔ لیکن وہ اب بھر نمایاں ہو چلے تھے اس کے چہرے پر کچھ مہاسے بھی نظر آ رہے تھے اور چہرے کا رنگ اگرچہ سیاہ نہیں ہوا تھا لیکن ذرا پکا ضرور پڑ گیا تھا۔

ابن شاید ان پراسرار تبدیلیوں کے بارے میں کچھ اور اظہار رائے کرتا لیکن سامنے والی گلی میں آہٹ ہونے سے دونوں کا دھیان ادھر چلا گیا۔ اچھے تحت اللفظ میں باآواز بلند شاعری کرتا چلا آ رہا تھا۔

''ایک دو دس۔ تیتر کی توڑوں نس۔ بنگلے کا توڑوں تالا۔ تو گن لے پورے بارہ''۔ ابن بولا۔ ''لے یار وہ اچھے بھی آ گیا۔''

مجو نے فوراً کہا۔ ''چپ کارہ یار ابن' اس سالے کو چکمہ دوں گا۔ ذرا مزا آئے گا'' اور

پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ادھر آ جا دیوار کے پیچھے۔''

مجو اور ابن دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ اچھے گلی کے نکڑ سے آن لگا تھا اس کی شاعری بدستور جاری تھی۔

''بارہ میں لگی رسی۔ تو گن لے پورے اسی۔

اسی میں لگا جو۔ تو گن......''

اور مجو نے اپنے حساب آواز کو انتہائی دہشت ناک بنا کر صدا لگائی ''ہو''

اچھے ٹھٹھک کر رہ گیا اور پھر بولا ''کون ہے بے؟''

مجو جواب میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

اچھے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ابن کو اس کی یہ ادا پسند نہ آئی' کہنے لگا ''تجھے ٹیپتائیں اے بھٹو' ابے آنکھیں ہیں کہ چوہے کے بھٹے۔''

اچھے نے پھریری سی لی ''کون......مجو؟''

مجو پھر ہنس پڑا۔

''ابے کب آیا تو'' اچھے کی حیرت زائل ہو چکی تھی۔ وہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ مجو کے جواب دینے سے پہلے ابن بیچ میں بول پڑا ''بس سالے اب سنبھل کے رہیو آ گیا ہے تیرا باوا۔''

اچھے نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں پڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس فقرے کو نظر انداز کر کے مجو سے براہ راست سوال کیا۔ ''یار واں تو نے بہت مزے کیے ہوں گے؟''

مجو انکساری برتتے ہوئے بولا۔ ''ارے نہیں یار' کچھ مزے وزے نہیں کیے' میرا تو وہاں بالکل جی نہیں لگا۔''

''یار یہ تو بہت اِترانے لگا ہے اب۔'' اچھے کا خطاب ابن سے تھا۔

ابن نے اچھے کی رائے سے اتفاق کیا۔ ''سمجھتا ہے کہ ولایت ہو آیا ہوں کالے آدمی سے بات کیوں کروں۔''

مجو نے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کی۔ ''نہیں یار یہ بات نہیں ہے خدا کی قسم کچھ مزے وزے نہیں تھے' اپنا تو وہاں ذرا جی نہیں لگا۔''

"دوست نہیں بنائے۔" سوال اچھے کا تھا۔

"نہیں یار وہاں کے لونڈے بڑے چونگھٹ ہیں' میں نے کئی لونڈوں کو گنتیا دیا۔"

"کیوں؟" ابن نے پوچھا۔

"سالوں سے پیچ لڑانے آتے نہیں کرموں کو روتے ہیں' میں ڈھیل دوں اور وہ سالے کھینچ لیویں۔ میں بھن گیا۔"

"تو سالے۔" ابن کہنے لگا۔ "تم نے پتنگ بازی ٹھاٹھ سے کی۔"

"ہاں پتنگیں تو خوب اڑائیں" اور اچانک مجو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ "یار ہمارا گھر بہت اچھی جگہ پر تھا۔"

اچھے نے ہاتھ کے ہاتھ اس کی بات کی تاویل کر دی "پتنگیں بہت کٹ کے آتی ہوں گی۔"

مجو نے بھی اس تاویل کو قبول کر لینے میں کوئی عذر نہیں سمجھا۔ "پتنگوں کی نہ پوچھو بڑی پتنگ لوٹی ہے۔"

"بڑے مزے کیے ہیں بیٹا نے۔" ابن کے لہجہ میں رشک کی بھی جھلک تھی۔

مجو کی آنکھوں میں پھر روشنی پیدا ہوگئی اور روشنی کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بھی گرمی آ گئی۔ "بھئی بڑے موقع پہ تھا ہمارا گھر" ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر رکتے ہوئے بولا "اور یار ہمارے گھر کے سامنے ایک اور گھر تھا۔"

ابن اور اچھے دونوں آنکھیں چھپکانے لگے ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ مجو کیا کہنا چاہتا ہے۔

"اچھا' پھر؟"

"یار وہ گھر جو تھا" تھا کے الف کو مجو نے خاصا طول دیا اور پھر ذرا گرما کر بولا "یار اس میں ایک لونڈیا رہوے تھی۔ بھئی غضب تھی۔"

پھر ابن کچھ اس انداز میں بولا گویا وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے کہنے لگا "ہوں تو یار جی تم عشق لڑا رہے تھے بہت پھنکیت ہو گئے ہو بیٹا۔"

"بھئی خدا کی قسم یہ بات نہیں تھی۔"

ابن اور بھڑکا "اچھا بیٹا ہمیں سے اڑان گھائیاں۔"

مجو نے اور زور و شور سے تردید کی "اللہ کی قسم یہ بات نہیں تھی۔"

اچھے نے فوراً ٹوکا' دیکھ بے جھوٹی قسم مت کھا۔"

مجو کچھ ہچکچایا لیکن پھر فوراً ہی بولا "ہاں خدا کی قسم اگر جھوٹ بولتا ہوں تو حضرت عباس کی مار مجھ پہ پڑے۔ اماں میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا ایک روز کیا ہوا کہ میں کوٹھے پر کھڑا تھا' پتنگ تنی ہوئی تھی۔" مجو ایک ذرا رکا اچھے اور ابن دونوں ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے مجو پھر بولا۔ "یار میں جو مزے میں آیا تو میں نے کھٹا کھٹ آٹھ دس ہاتھ مارے اور کھٹ سے ڈھیل چھوڑ دی پتنگ ایسے جھونکے کھانے لگی جیسے ٹوٹ گئی ہو۔ میاں سامنے والے کوٹھے پہ کیا دیکھوں ہوں کہ ایک لونڈیا...... بھئی کیا چیز تھی میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ ڈور نیچے ہوتے ہوتے اس کے دوپٹے کو چھو گئی میں ایک ساتھ چونکا کہ لو یار پتنگ گئی میں نے کھٹ سے دو تین ہاتھ مارے اور پتنگ تارا بن......"

اچھے بیچ میں بول اٹھا "ابے جا یار" اس کے لہجے میں تاسف کی جھلک تھی۔

ابن کا لہجہ مذمت آمیز تھا "وابے چونگھٹ' میں ہوتا تو قسم اللہ کی ہتھے پہ سے پتنگ توڑ دیتا۔"

مجو کو محسوس ہونے لگا کہ اس نے واقعی یہ بڑی غلطی کی کہ ہتھے پہ سے پتنگ نہیں توڑی لیکن پھر فوراً ہی وہ اس اثر کو زائل کرنے پہ تل گیا۔ "ہٹ یار چھٹانک بھر کی لونڈیا کے پیچھے میں اپنی پتنگ گنواتا حد ہوگئی ابے ہم پتنگ اڑاوے ہیں دل لگی نہیں کرتے اماں کئی دفعہ تو ایسا محسوس ہوا کہ سامنے سے گزر گئی اور میں نے پتنگ کی دھن میں دیکھا ہی نہیں۔"

"اچھا تو روز جلوے ہوتے تھے۔"

ابن کے فقرے نے اسے اور ایڑ دی۔ "یار ایک روز جو میں کوٹھے پہ گیا تو کیا دیکھوں ہوں کہ وہ دوپٹہ سکھاری اے فیروزی دوپٹہ اور اس پہ ستارے ٹنکے ہوئے قسم خدا کی میں تو یہ سمجھا کہ دیوالی ہو رہی ہے...... یار وہ خود بھی بس ایسی تھی جیسے کسی نے دیا جلا کے رکھ دیا ہو۔"

"مگر تیرے گھر بھی کچھ اجالا وجالا ہوا۔" ابن بے تحاشا ہنس پڑا۔

اسے دیکھ کر اچھے اور مجو کے چہروں پہ بھی سنجیدگی طاری ہوگئی۔

ابن نے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا "تو نے اسے اشارہ کیا تھا؟"

''نہیں۔''

ابن تاسف آمیز لہجے میں بولا ''یار تو تو بالکل اناڑی نکلا۔''

اچھے کے چہرے پہ بھی تاسف کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور مجو ناکامی کے احساس سے مارے شرم کے زمین میں گڑا جا رہا تھا اسے یقین ہوگیا کہ وہ واقعی اناڑی ہے اور اپنے اناڑپن پہ اسے غصہ آنے لگا۔

رفتہ رفتہ تاسف کی کیفیت دھیمی پڑنے لگی اور ابن بہک کر دوسرے رستے پہ جا نکلا۔

''یار اگر میں ہوتا تو خدا کی قسم مزا آ جاتا۔ میاں لونڈیا پھنسانے کا بھی ایک گُر ہوتا ہے وہ ہم سے پوچھو۔''

اچھے نے پوچھا ''کیا گُر ہے؟''

''بس ہے ایک گُر۔'' ابن ترنگ میں آ کے بولا۔ ''لونڈیا ذرا اڑنگے میں آجائے' پھر خدا کی قسم بچ کے نہیں جاسکتی یار جی کے پاس بہت زور کا نسخہ ہے۔''

''کیا نسخہ ہے؟ بتا نا۔'' مجو نے بے چین ہو کر پوچھا۔

ابن نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''بتانے کی بات غلط ہے۔''

اچھے کو ابن کی اس روش پہ بہت تاؤ آیا۔ ''مجو پوچھ اس سے سالا اپنے آپ کو ذرا بنتا ہے۔''

مجو اور اچھے دونوں کے رویے میں بائیکاٹ کا رنگ پیدا ہوگیا۔

ابن نے یہ رنگ دیکھا تو فوراً نرم پڑ گیا۔ ''اچھا دیکھ بے مجو میں تجھے بتاؤں اب کے جو تُو جاوے......''

''واپس تو جاؤں گا......مگر......'' مجو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ابن اور جھلایا ''مگر دریا میں رہوے ہے۔ مگر کیا؟''

''یار......'' مجو پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

اچھے نے اسے جھڑکا۔ ''یار یار کیا کہتا ہے بے۔ بات بتانا''

اور مجو کے لہجہ میں درد کی ایک کیفیت پیدا ہوگئی ''یار وہ مرگئی۔''

''مرگئی؟''

''ہاں''

رات ہو چکی تھی۔ آسمان کے ٹمٹماتے ہوئے اِکا دُکا چراغوں کی لو اک ذرا تیز ہوگئی تھی۔ اللہ راضی کو شاید آج کوئی سواری نہیں ملی تھی ورنہ وہ گاڑی سے اتنی دیر سے کیوں پلٹتا۔ لیکن اب تو اس کے اِکّے کے پہیوں کی آواز بھی معدوم ہو چکی تھی۔ سڑک خاموش تھی۔ میونسپلٹی کی لالٹین کی پیلی روشنی زیادہ دور تک نہ سہی مگر صوفی جی کے گھر کے سامنے والے چبوترے پہ ضرور پہنچ رہی تھی۔ جہاں اب مجو ابن اور اچھے جا بیٹھے تھے۔

ابن نے دھیرے سے پوچھا۔ ''کیسے مرگئی؟''

''بس زوروں کا بخار آیا' مرگئی......رات رات میں چٹ پٹ ہوگئی۔''

''ہاں۔'' اس کی آواز میں رقت کی ایک ہلکی سی جھلک آ گئی تھی۔

''میں سمجھ گیا۔'' اچھے کچھ سوچتے ہوئے بولا مجو اور ابن اسے تکنے لگے' اس کی آنکھوں میں ایک طلسمی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا ''اس پہ کوئی جن عاشق ہو گیا تھا وہ اسے پرستان لے گیا۔''

مجو اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر اس نے جھرجھری سی لی شاید اسے رستہ مل گیا تھا وہ آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ''میں جو اس شام کو کوٹھے پہ چڑھا تو کیا دیکھوں ہوں کہ اس کی چھت کی منڈیر پہ ایک دیولا ٹمٹما رہا ہے میں حیران کہ یار آج یہ دیولا کون جلا گیا اس کی لو مندی پڑتی گئی' مندی پڑتی گئی......'' اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی وہ رک گیا۔

اچھے نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھا' پھر دبی سی آواز میں بولا۔ ''پھر؟''

پھر وہ بولا ''ہولے سے بجھ گیا۔'' مجو پھر چپ ہوگیا ابن اور اچھے اسے چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ خاموشی کی خواب ناک تہوں میں لپٹی ہوئی وہ آواز پھر بہک نکلی۔ ''میری الٹی آنکھ صبح سے پھڑک رہی تھی اور دل ڈوبا جاوے میں کہوں کہ بات کیا ہے رات کو میں نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا...... میں نے دیکھا کہ میری پتنگ ٹوٹ گئی ہے اور میں کوٹھوں کوٹھوں اس کے پیچھے دوڑا چلا جا رہا ہوں۔ میں دوڑے گیا دوڑے گیا۔ پھر کیا دیکھوں ہوں کہ ایک میدان ہے چٹیل میدان سنسان بیابان' آدمی نہ آدم زاد اور پتنگ غائب' میری پٹ سے آنکھ کھل گئی'' اس کی بہکی ہوئی آواز میں ہلکا سا جھٹکا آیا۔ وہ ایک لمحہ رُکا اور اس کی آواز میں پھر خواب کی سی

کیفیت پیدا ہوگئی۔ ''تڑکے کا وخت' سامنے والی دیوار کی منڈیر پہ چاندنی کی پٹی سے پھیلی ہوئی تھی' بڑی پھیکی چاندنی تھی...... آسمان پہ ایک تارا ٹمٹما رہا تھا مجھے ایسا لگا کہ وہ کانپ رہا ہے میں اسے دیکھے گیا' دیکھے گیا میری آنکھیں بند ہونے لگیں مجھے نیند آ گئی پھر میں نے جنہیں کیا خواب دیکھا اور پھر جنیں کیسے ایکا ایکی میری آنکھ کھل گئی۔ اجالا ہوگیا تھا مجھے ایسا لگا کہ کہیں کوئی رو رہا ہے میں نے کان لگائے کوئی سچ مچ رو رہا تھا۔ پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔''

اچھے بہت دیر کے بعد پھر ٹھنکا' مگر اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور بہت ہی مختصر۔

''اچھا''

''ہاں'' مجو کی آواز پھر ڈوبنے لگی تھی' میری آپا جی تھیں انہوں نے کنواڑ کھولے کہنے لگیں...... مجو میں سامنے والی کے جا رہی ہوں اس کی لونڈیا گزر گئی ہے۔'' مجو کی آواز بھرا گئی شاید اس کی آنکھ بھی بھر آئی تھی وہ خاموش ہوگیا ابن اور اچھے بت بنے بیٹھے تھے۔ لالٹین کی پیلی روشنی اب ذرا کچھ اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی رات بھیگ چلی تھی۔

پھر ابن نے ایک جماہی لی۔ شاید وہ کسی طلسمی جال سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجو کو بھی دھیرے دھیرے سے یاد آ رہا تھا کہ وہ کن سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ ذرا سنبھلتے ہوئے بولا ''یار......'' مگر وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ابن اسے پھر تکنے لگا ''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

اچھے اسے خاموش دیکھتا رہا' پھر لجاجت سے بولا ''یار! بتا' ناں۔''

اور مجو کے لہجہ میں ایک کسک پیدا ہوئی۔ ''یار مجھے اس لونڈیا سے ...... کچھ...... بس کچھ......'' وہ رُکا گلی میں قدموں کی آہٹ ہوئی اماں جی آواز دے رہی تھیں۔ ''ارے مجو' ارے بیٹا' روٹی تو چل کے کھالے۔''

مجو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھے بولا۔ ''یار' بیٹھ بات کر' نا۔''

اور ابن نے دکھ بھرے لہجے میں کہا ''یار یہ تیری اماں جی ہتھے پہ ٹوک دیوے ہے۔''

☆......☆......☆

کیلا

آم کے پتوں کی بیل دروازے پہ اب تک لٹک رہی تھی۔ شروع میں جب یہ آویزاں کی گئی تھی تو اس مکان کی پیشانی پہ جھومر سا لگتی تھی لیکن اب تو اس کی ہریالی اور شادابی بالکل زائل ہو چکی تھی۔ دروازے کے عین اوپر چھت پہ پھچیوں' رنگین کاغذوں اور پنی سے تیار شدہ جو دو گھوڑے کھڑے تھے ان کی چمک دمک بھی اب ماند پڑ چکی تھی۔ یہ تو خیر شام کا وقت تھا لیکن اب دھوپ میں بھی وہ پہلے کی طرح جگر جگر نہیں چمکتے تھے۔ ہاں مکان کی سفیدی اور کواڑوں کے روغن کی بہار ابھی زیادہ پھیکی نہیں پڑی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اس مکان پہ دیوالی کے علاوہ سفیدی اور روغن ہوتے دیکھا تھا۔ دیوالی پر تو یہ معمول تھا کہ ایک دن پہلے مکان کے اندر' باہر سفیدی ہوتی۔ کواڑوں پر روغن ملا جاتا' کوڑے کچرے کے پرانت کے پرانت دروازے کے سامنے پھینکے جاتے اور پھر کیلا ایک کٹوری میں گیرو گھول کر دروازے پر آتی اور چوکی سے اوپر سفید دیوار پر بڑی نفاست سے مربع کی شکل میں لال چار خانہ سا بنا دیتی۔ مگر اب تو وہ بیاہ کر سسرال جا چکی تھی۔ اس خیال سے اسے بڑی تسکین ہوئی۔ سب کچھ کیا دھرا کیلا ہی کا تو تھا۔ دیولا پاس سے گیا تھا تو چلا جاتا آخر دیوالی پر بھی وہ ہر مکان سے تو دیولے چرانے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن کیلا اور کیلا کی ماں نے تو وہ فتنہ بپا کیا تھا کہ اس کی شاموں کی فرصت ہی ختم ہوگئی۔ یہ اتفاق تھا کہ آج ماسٹر کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور اس نے اسے چھٹی دے دی تھی ورنہ اس وقت وہ کیا اسی اطمینان سے اپنے مکان کے دروازے کی چوکی پر بیٹھا ہوتا۔ جھٹپٹا ہو چلا تھا اور پاس کے مندر میں گھنٹہ بجنا شروع ہوگیا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ کیلا کے دروازے کے طاق میں ابھی تک دیوا نہیں جلا ہے اور ڈیوڑھی جو اس وقت ننگے پیروں کی شیریں آہٹ سے جاگ اٹھا کرتی تھی سنسان ہے۔ بناؤ سنگھار سے کوسوں دور' اُجلا چہرہ' میلی ساڑھی' چال ڈھال میں عجلت کی کیفیت' گویا بڑی مصروف ہے اور اس کی

ذراسی چوک سے گھر کا انتظام درہم و برہم ہو جائے گا۔ آہنی جال سے پٹا ہوا اندھیارا آنگن سارا دن اس کی مصروفیتوں کے شور سے گونجتا رہتا۔ نل سے گرتے پانی کا شور' جھوٹی تھالوں اور سنی ہوئی پرانتوں کا شور جن پہ لسی ہوئی گیلی راکھ پر ایک ساتھ پانی کے تریڑوں کی آواز آتی اور اچانک یہ آواز بند ہو جاتی اور آنگن میں پانی کی بالٹیوں کے اُلٹنے' بھیگے ہوئے کھرنجے پر جھاڑو کے سڑسڑ کرنے اور بہتے ہوئے پانی پر' ننگے پیروں کی چھپ چھپ کا خوشگوار شور اتنا بلند ہوتا کہ گلی میں گزرنے والوں کو گمان گزرنے لگتا کہ یہاں کوئی بارات اترنے والی ہے کہ اتنے میں ڈیوڑھی میں تیزی سے اٹھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سے ایک لہر سی دوڑ جاتی جو گیلے کچرے کی تھالی دروازے کے ایک طرف گلی میں الٹنے کے بعد اسی تیزی سے فوراً کے فوراً واپس ہو جاتی اور گلی کی فضا لمحہ بھر کے لئے چمک اٹھنے کے بعد پھر ماند پڑ جاتی اور پہلے کی طرح اونگھنے لگتی۔ دوپہر کو ایک مرتبہ ضرور وہ دروازے پہ آتی اور بڑی عجلت میں آواز دیتی۔ ''بھیا ارے او بھیا تو کو ماں بلا رہی ہے لالہ کو دکان سے بلائے لیا۔ رسوئی بن گئی۔'' شام کو ایک بار پھر وہ باہر آتی تھالیوں' کٹوریوں اور چمچوں کے شور میں ایک آواز بلند ہوتی۔ ''کیلا۔ اری کیلا۔ سانجھ ہوگئی۔ دیوا بال دے۔'' اور ادھر مندر میں گھنٹہ بجنا شروع ہوتا اور ادھر وہ باہر نکلتی مگر اس مرتبہ اس کی چال دھیمی ہوتی۔ چراغ کے بجھنے کا بھی تو دھڑکا ہوتا تھا۔ طاق میں چراغ رکھ وہ اُلٹے پاؤں اندر لوٹ جاتی۔ خاموش گلی کبھی کبھی کسی راہگیر کے قدموں کی چاپ سے غشی سے جاگتی نظر آتی تھی مگر قدم گزرے چلے جاتے اور پھر وہی خاموشی۔ مندر سے آتی ہوئی گھنٹے کی آوازیں اور گھنٹے کی غنودآمیز آوازوں کے اس رینگتے ہوئے ٹوٹتے جڑتے تسلسل میں سنکھ کی آواز کا میل اور کیلا کے جلائے ہوئے دیئے کی لو ایسے خواب آور انداز میں دھیرے دھیرے کانپتی رہتی گویا وہ بھی اسی تسلسل میں شامل ہے اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ کیلا کے دروازے پر اس باقاعدگی سے روز دیا کیوں جلتا ہے۔ دیوالی کے دیوے کی رسم تو اسے معلوم تھی لکشمی اندھیرے گھر میں قدم کب رکھتی ہے۔ روشنی روشنی کو کھینچتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے مگر یہ بارھوں مہینے چراغ کا جلنا کیا معنی۔ پھر کسی کسی شام کو چوکھٹ کے برابر نالی کے کنارے سندور اور کھیلوں کے دائرے میں ایک ننھا ساٹمٹماتا ہوا کورا دیولا۔ یہ کیوں؟ مگر اس نے ایسے سوالوں پر کبھی زیادہ سوچنے کی مصیبت مول نہیں لی وہ تو بہت سیدھی سی ایک بات

جانتا تھا کہ کورا دیولا جہاں بھی اور جس دن بھی نظر آئے پار کر دینا چاہیے۔ وہ دیوالی کی رات ہو یا جمعرات کی شام اور وہ گلی کے مندر کی منڈیر ہو یا کیلا کے دروازے کا طاق۔ وہ اپنے دروازے کی چوکی پر تاک لگائے بیٹھا رہتا۔ کیلا طاق میں دیا رکھ کر اندر گئی گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔ دبے پاؤں دروازے پہ پہنچ پھونک مار کے بتی بجھائی۔ تیل الٹا اور دیولا تھیلے میں رکھ' الٹے پیروں لپک جھپک واپس۔ کیلا کی ماں نے بہت مرتبہ مار پیچھے پکار کی اور ہوا میں تیر چلائے مگر کوئی سینہ چھلنی نہیں ہوا۔ ہاں کیلا نے اسے ایک روز پکڑ لیا تھا اس نے دیولے پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کیوں لے رہا ہے دیولا۔''

اس نے دیولا فوراً رکھ دیا اور گھبرا کر کہنے لگا۔ ''میں نے کب لیا ہے۔'' اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کیلا کی گرفت اور سخت ہوگئی۔ یوں کیلا بھی کونسی پوری عورت تھی۔ یہی کوئی سترہ اٹھارہ کا سن ہوگا مگر اس کے مقابلہ میں تو وہ بہت بڑی تھی۔ جب ہاتھ چھڑا نہ سکا تو اس نے کیلا کی کلائی پہ کاٹنے کی کوشش کی۔ اس نے بھینچ کر کاٹنے کا ارادہ کیا تھا لیکن کلائی سے مس ہوتے ہی اس کے دانتوں کی کچکچاہٹ ختم ہوگئی۔ ہونٹوں کے کناروں پر اور دانتوں تلے ایک شہد آمیز نرمی سی دوڑ گئی۔ کیلا کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ اس کی کلائی چھوڑ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔ وہ اک ذرا ہانپنے لگی تھی۔ اس نے اپنی کلائی کو جو اس کے لبوں اور دانتوں کے لگنے سے نم آلود ہوگئی تھی آنچل سے پوچھا' سر پہ ساڑھی کا پلو درست کیا اور عجلت سے اندر چلی گئی۔

وہ یہ تو نہ سمجھ سکا کہ بات کیا ہوئی مگر وہ شہد آمیز نرمی اس کے ہونٹوں اور دانتوں کے کناروں پر دیر تک ایک عجیب سی لذت کے ساتھ گھلتی رہی۔

اسے وہ کیفیت پھر یاد آ گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ داستان ایک بار پھر دوہرائی جائے۔ شام دبے پاؤں بڑھ رہی تھی۔ گھنٹے کی گویا ہر گونج کے ساتھ سیاہی کی ایک لہر ابھرتی اور آہستگی سے پھیلتی چلی جاتی۔ اس کی نگاہیں کیلا کے طاق کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ دیا اب تک نہیں جلا ہے کیلا چلی گئی ہے نا۔ خیر اچھا ہی ہوا کہ وہ چلی گئی اس نے اپنی ماں کو شاید بتا دیا تھا جب ہی تو اس نے اس کی امی سے شکایت کی تھی۔ ''اماں تھرا بالا ہمارا دیوا اٹھا کے لے جاوے ہے۔''

اس کی امی نے بہت ڈانٹ کر اس سے کہا۔ ''کیوں اب چوری بھی کرو گے۔'' وہ صاف مکر گیا اور امی کو یقین آ گیا اس نے کیلا کی ماں کو جواب دیا۔ ''بی بی ہمارا لڑکا جھوٹ نہیں

بولتا۔ اس نے اگر تمہارے دیوے لیے ہوتے تو بتا دیتا کسی اور نے چرائے ہوں گے۔"

اس نے پھر اپنا کام شروع کر دیا مگر احتیاط سے۔ اِدھر اُدھر خوب دیکھ بھال کے چپکے چپکے طاق پر جاتا اور اسے ڈر لگتا رہتا کہ کہیں کیلا پھر آ کر اس کی کلائی نہ پکڑ لے۔ اس خیال سے اس کا دل دھڑکنے لگتا اور بس یوں لگتا کہ اب اس کی کلائی کسی نے پکڑی۔ مگر جب وہ صحیح وسلامت دیولا لے کر چلا آتا تو اسے اس کامیابی پر خوشی بھی ہوتی اور اک ذرا مایوسی بھی۔ ایک شام اسے کیلا نے واقعی پکڑ لیا مگر پہلے کی طرح نہیں اس نے دور سے کھڑے کھڑے شور مچانا شروع کر دیا۔ "ماں ری او ماں۔ یہ للہ دیوا لیے جا رہا ہے۔" کیلا کی ماں کوستی کاٹتی باہر نکل آئی۔ اس کی امی نے یہ سنا تو انہوں نے اس مرتبہ واقعی اسے پیٹ ڈالا۔ "محلے کے بچوں کے ساتھ کھیل کھیل کے بگڑا جا رہا ہے۔ لے میں کل ہی ماسٹر صاحب سے کہلوا بھیجتی ہوں کہ اسے شام کو پڑھا دیا کرو۔ نہ گھر میں رہے گا نہ دائی توائی پھرے گا۔" اور اس کے بعد واقعی وہ ماسٹر کے ساتھ بندھ گیا۔

شام کی سیاہی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ چھت پر رکھے ہوئے گھوڑوں کے گرد دھند اتنا چھا گیا تھا کہ ان کے رنگ و نقش اس میں تحلیل ہو گئے تھے۔ بس گھوڑوں کے دو ہیولے سے نظر آ رہے تھے مگر اس کی نگاہیں طاق پر ہی تھیں جہاں ابھی تک اندھیرا پڑا تھا۔ اسے اپنے دیولوں کی یاد آ رہی تھی جو گنتی میں بہت کم رہ گئے تھے۔ دیوالی پر اس نے بہت سے دیولے جمع کر لیے تھے مگر اس میں کافی ٹوٹ بھی تو چکے تھے۔ دیوالی دور تھی' اور کیلا کے طاق پر ہاتھ صاف کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اس نے جمائی لی اور اکتا کر چوکی سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا۔

اس شام کیلا کے طاق میں دیا دیر سے جلا۔ گھنٹے کی مضمحل آوازیں ڈوب جانے کو تھیں کہ کیلا کی ماں لپک جھپک باہر آئی دیا جلایا اور فوراً اندر چلی گئی۔

گلی خاموش تھی۔ مندر کا گھنٹہ بجنا شروع ہو چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں طاق کے قریب پہنچا۔ کورا دیولا' روئی کی تازہ بنائی ہوئی بتی جو تیل کے اثر سے زرد پڑ گئی تھی' ٹمٹماتی ہوئی لو۔ پھر بھی اسے وہ دیولا بجھا بجھا' بے رنگ سا لگا۔ یا شاید اس کا دل ہی اس وقت کچھ بجھا بجھا سا ہو رہا تھا۔ کورے ٹمٹماتے ہوئے پھیکے دیوے کو وہ بے دلی سے دیکھتا رہا اور پھر اسے ہاتھ لگائے بغیر ایک اکتاہٹ کے ساتھ الٹے پیروں لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

ساتواں در

اماں جی اسے سیّد صاحب کہتی تھیں اور اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھیں کہ اسے کوئی پریشان نہ کرے۔ ایک دفعہ جب ہمارے بھائی جان نے اس پہ غلیل تانی تھی تو اماں جی نے جھپٹ کے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور تھر تھر کانپنے لگیں۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے تو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ کیا ہوا کہ دعا کے بعد سجدہ کرتے کرتے انہیں جھپکی آ گئی۔ دیکھا کہ ایک بزرگ' نورانی صورت سفید کپڑے پہنے' کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔ ہڑبڑا کے جاگیں اور سر اٹھا کے دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ بس کنگنی پہ کبوتری کی دو ننھی منی آنکھیں ہولے ہولے ہلتی ہوئی گردن کے ساتھ تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایک روز تو میں نے بھی دیکھا تھا کیا ہوا کہ تڑکے کے وقت میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب تو جانیں کیا تھا' میں بھول گیا' آخر میں مجھے ایسا لگا کہ کوئی سفید دھوپ سی خوبصورت چیز کمرے سے باہر جا رہی ہے اور میں نے اسے چھونے...... مگر ایک ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ تڑکا ہو گیا تھا اماں جی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہی تھیں اور وہ ماں جی کے قدم باہر رکھنے سے پہلے ان کے سر سے گزری چلی گئی۔ مجھے بس ایک پرچھائیں سی دکھائی دی اور بازوؤں کی میٹھی میٹھی پھڑ پھڑاہٹ۔

اماں جی بتاتی ہیں کہ پہلے اس کنگنی پہ جنگلی کبوتروں کے اتنے جوڑے رہتے تھے کہ جب وہ صبح کواڑ کھلنے پر دروازے سے باہر نکلتے تو آنگن پہ گھٹا سی چھا جاتی تھی۔ ایک دفعہ ہمارے چھوٹے چاچا نے ان پہ بندوق چلا دی اور ایک کبوتر گرا لیا۔ بس پھر سارے کبوتر اُڑ گئے' کنگنی خالی رہ گئی۔ اماں جی کہا کرتی ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہمارے گھر میں مہمان پہ مہمان اترتا تھا اور چولہا چوبیسوں گھنٹے گرم رہتا تھا۔ مگر اس کے بعد تابڑ توڑ ایسی پریشانیاں آئیں کہ جما جمایا گھر تنکوں کی طرح بکھر گیا۔

وہ سارے کبوتر اُڑ گئے اب تو ان کے کسی گھونسلے کا تنکا بھی کنگنی پہ نظر نہیں آتا' مگر یہ کبوتری پھر بھی باقی رہ گئی۔ اس نے جاتے ہوئے قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا تھا شاید اسی گرے ہوئے کبوتر کی مادہ تھی۔ جہاں میری چارپائی بچھی ہے اس کے بالکل سامنے اس کا گھونسلہ تھا۔ گھونسلے کی شکل میں تنکے تو اب تک جمے رکھے ہیں۔ کنگنی اتنی اونچی ہے کہ میں انہیں چھو کر نہیں دیکھ سکتا' پھر بھی وہ مجھے ٹھنڈے ٹھنڈے سے لگتے ہیں۔ جب تک وہ کبوتری یہاں رہی' یہ کیسے نرم گرم دکھائی پڑتے تھے۔ رات کو سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل جاتی۔ اندھیرے اور خاموشی میں کنگنی پہ ان تنکوں کے پاس پروں کی دھیمی سی پھڑ پھڑاہٹ ہوتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہتی یہاں تک کہ میری پھر آنکھ لگ جاتی صبح کو جب میں جاگتا تو غوں غوں کے مدھم شور سے ہمارا سارا کمرہ گونجتا ہوتا پھر اسی غوں غوں کی آواز سے آنکھوں میں نیند سی بھر جاتی اور میرے پپوٹے بند ہوتے چلے جاتے مگر جاڑوں میں اسی میٹھے مدھم شور سے میری آنکھ کھل جاتی اور جب دیوار پہ میلے شیشے والے روشندان کے بالکل سامنے والی جگہ پہ میری نظر پڑتی تو وہ جگہ اک ذرا اجلی سی نظر آتی۔ پھر اس غوں غوں کی اٹھتی ہوئی نرم لہروں سے دیواروں کی کالونس ڈھلتی چلی جاتی اور وہ اجلا دھبہ پھیلتا چلا جاتا۔ اماں جی لیٹے لیٹے کھنکارتیں اور ذرا دیر کے لئے اٹھ کر سرہانے سے لوٹا اٹھا دروازے کی طرف بڑھتیں۔ جس کے کھلتے ہی کمرے میں ٹھنڈی ٹھنڈی' ہلکی سفید روشنی بھر جاتی جو کبوتری پہ ایک جادو سا کر دیتی اور وہ ایک ساتھ پھریری لے کر گردن کو گھما کر آگے بڑھاتی اور بازوؤں سے پٹاخ پٹاخ کا شور کرتی ہوئی دروازے سے باہر نکل جاتی۔ سامنے منڈیر پر بیٹھتی اور ایک دفعہ گردن کو جنبش دے کر پھر اڑتی ہوئی سب سے اوپر کی چھت کے پرے جاتے ہوئے کہیں گم ہو جاتی۔ شام کو اذان سے ذرا پہلے وہ پھر اسی منڈیر پہ دکھائی پڑتی۔ مگر اس مرتبہ تھکی ہاری جیسے کوسوں کا سفر کر کے آتی ہے۔ چونچ میں تنکا جسے احتیاط سے دبائے وہ کمرے کا رُخ کرتی جہاں پھیلتے ہوئے اندھیرے میں گھونسلے کے پاس اس کے پروں کی ایسی آواز ہوتی جیسے کھرل میں ہولے ہولے سرمہ پیسا جا رہا ہے اور گھونسلہ مل جانے پہ ذرا دیر کے لئے جھوک کھاتی ہوئی پتنگ کی سی سرسراہٹ ہوتی۔ پھر خاموشی پھیل جاتی جب کبھی وہ دن میں کنگنی پہ دکھائی دیتی تو ایسے جیسے ہے ہی نہیں بس کبھی کبھی گردن ہلتی نظر آتی یا وہ ننھی منی تارا سی اداس

آنکھیں جنہیں دیکھ کر ہمیشہ ایسا لگتا کہ اسے کوئی روگ لگا ہوا ہے سوکھے تنکوں کے اس گھروندے میں وہ ایسے بیٹھی رہتی جیسے کسی کے سوگ میں بیٹھی ہے۔

اماں جی کی بات کا مجھے پکا یقین تھا۔ سچی بات ہے' کبوتری تو وہ کسی حال میں نہیں تھی لگتا تھا کہ وہ تھی کچھ اور' کبوتری بن گئی ہے۔ کیا خبر ہے کوئی سیّد صاحب ہی ہوں! اماں جی نے کبھی کوئی جھوٹا خواب تو دیکھا نہیں تھا اور وہ تو اصل میں خواب بھی نہیں تھا جب منی نے کہا کہ یہ سید صاحب نہیں ہیں تو مجھے بہت عجیب سی بات لگی۔ خالہ جان کو آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے انہیں تو خیر میں نے پہچان لیا کہ یہ خالہ جان ہیں۔ اماں جی مجھے یہ کہہ کر ان کے گھر لے گئی تھیں کہ چل تیری خالہ آئی ہے اسے سلام کر آ' مگر انہوں نے یہ کب بتایا تھا کہ ان کے ساتھ منی بھی آئی ہے جھینپنا وپنا تو کیا تھا' بس اتنی بات تھی کہ اس نے بہت اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے اور میرے کپڑے' میلے تو نہیں تھے' ہاں پائینچے میں گٹے کے پاس کھونتا آ گیا تھا اور کرتے پہ روشنائی کا دھبّہ پڑ گیا تھا۔ ہاں میں نے منہ نہیں دھویا تھا اور منی کا گورا بھبھوکا چہرہ ...... خیر جی میں اس سے بولا نہیں' امی جان کے کولھے سے لگا چپکا بیٹھا رہا۔ وہ کتنی لمبی لگ رہی تھی۔ خالہ جان کی باتیں دیکھو کہنے لگیں کہ تم دونوں کی ایک برس کی پیدائش ہے۔ ہو گی' مجھے تو وہ بہت بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ تو خیر' میں اس سے بولا وولا نہیں۔ دوسرے دن جب وہ ہمارے گھر آئی تو اس نے خود ہی مجھ سے بات کی۔ میں نے اسے اپنی لال نیلی پنسل دکھائی۔ پھر ڈرائینگ کا رنگوں کا ڈبہ دکھایا' پھر کوڑیاں دکھائیں۔ کبوتری کا گھونسلہ بھی میں اسے دکھاتا ہی مگر اس کی نظر خود ہی اس پہ جا پڑی۔

''ارے' گھونسلہ۔'' وہ خوشی سے چونک پڑی۔

میں نے جواب دیا کہ ''ہاں' کبوتری کا گھونسلہ ہے یہ۔''

کبوتری چوکنی ہو گئی۔ اس نے پھریری لی اور ایک دم سے پھٹ پھٹ کرتی اُڑ گئی۔

''وہ اُڑ گئی۔'' منی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے سادگی سے کہا کہ ''اُڑ جانے دو' گھونسلہ تو یہیں ہے پھر آ جائے گی۔''

''اسے پکڑنا چاہیے۔'' اس نے تجویز پیش کی۔

میں سہم گیا' ہولے سے بولا۔ ''نہیں ...... سید صاحب ہیں۔''

"سید صاحب؟" منی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"سید صاحب تو ہیں ہی۔" میں ذرا جھینپ سا گیا تھا۔

"سید صاحب" وہ بے تحاشا ہنسنے لگی اور اس کی ایک کالی چمکیلی لٹ گورے گال پر آ پڑی۔ "ہاہا ہا......سید صاحب۔"

میں بہت چپ ہوا۔ "نہیں ہیں سید صاحب؟"

وہ ہنستے ہنستے رُکی اور کہنے لگی۔ "'بادل خان' کبوتری سید صاب کیسے ہو جاوے گی۔ کبوتری تو پری ہووے ہے۔"

"پری'؟" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں' پری۔ بہرام بادشاہ کی کہانی سنی ہے؟"

"سنی ہے پھر؟"

"واہ بادل خان" وہ بے تکلفی سے کہنے لگی۔ "اس میں شہزادہ تھا نہیں' اسے سفید دیو نے محل کے ساتوں دروں کی تالیاں دے دی تھیں اور کہہ دیا تھا کہ سب در کھولیو' ساتواں در مت کھولیو۔ شہزادہ روز چھیوں در کھولتا' دیکھتا' بند کر دیتا۔ آخر وہ چھیوں دروں سے اُکتا گیا۔ ایک روز وہ سوچنے لگا کہ ساتویں در کو سفید دیو نے کھولنے سے کیوں منع کیا ہے آخر اس میں کیا ہے' دیکھنا تو چاہیے کہ اس میں بھید کیا ہے' اس نے کیا کیا کہ ساتواں در کھول لیا...... اندر جو گیا تو دنگ رہ گیا۔ جھم جھم جھماتے پانی کا بڑا سا حوض' اور خوبصورت کبوتریاں چھم چھم حوض پہ اتر رہی ہیں' ڈبکی لگاتی ہیں اور پری بن جاتی ہیں۔"

میں نے اماں جی سے کہانی سن رکھی تھی' پھر بھی مجھے ایسا لگا کہ میں پہلی پہل یہ کہانی سن رہا ہوں۔

منی پھر بولی۔ "اور ان میں ایک سبز پری تھی جس کے شہزادے نے کپڑے چھپا دیئے تھے۔ لمبے لمبے بھیگے بالوں والی سبز پری' حوض میں ننگی کھڑی ہوئی' شہزادے کی خوشامد کر رہی ہے اور شہزادہ کپڑے دیوے نہیں۔" مجھے منی کی بات کا یقین آ گیا واقعی یہ کبوتری بھی پری ہی ہوگی ہم دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس کا پتہ لگانا چاہیے۔ منی کا خیال تھا کہ کبوتری منڈیر سے اڑ کر سب سے اوپر والی چھت پر جاتی ہے اور مٹی میں لوٹ پوٹ کے پری بن جاتی ہے

'اور پھر پریوں کے تخت پہ بیٹھ کر اڑ جاتی ہے۔

دوسرے دن منی پھر آئی اور ہم دونوں اس تاک میں آنگن میں بیٹھے رہے کہ جس وقت کبوتری کمرے سے باہر نکلے گی تو ہم اس کے پیچھے پیچھے چھت پر جا کے دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ جب بہت دیر تک کبوتری باہر نہ نکلی تو میں نے اندر جا کر کنکر مار مار کر اسے اڑایا اور پھر اس کے پیچھے تیزی سے اوپر دوڑے۔ مگر جب سب سے اوپر کی چھت پہ پہنچے تو کبوتری غائب۔ بڑا افسوس ہوا۔ اگلے دن ہم نے یہ کیا کہ چپکے سے اوپر والی چھت پہ جا بیٹھے اور گھات میں لگے رہے کہ دیکھیں کبوتری کب آتی ہے اور کیا کرتی ہے؟ کبوتری آئی تو سہی مگر اتنی دیر بعد کہ انتظار میں بیٹھے بیٹھے ہمارے گھٹنے دکھ گئے اور میرا سیدھا پاؤں بالکل سو گیا تھا۔ پھر بھی نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ وہ پہلے دوسری منزل والی اسی منڈیر پر بیٹھی اور پھر اڑ کر ہمارے اوپر سے گزرتی چلی گئی۔

"اس نے ہمیں دیکھ لیا۔" منی مایوس ہو کر بولی۔

آخر منی کی تجویز پر عمل ہو کر ہی رہا۔ ہم نے سوچا کہ اسے بغیر پکڑے یہ بھید نہیں کھلے گا۔ ہم نے دوپہر کے وقت جب وہ اپنے گھونسلے میں بیٹھی تھی' کمرہ اندر سے بند کر لیا میں باہر سے وہ لمبا والا بانس اٹھا لایا جس سے میں کٹی پتنگیں لوٹتا تھا۔ وہ بانس میں نے آہستہ آہستہ کنگنی پہ پٹخانا شروع کر دیا۔ کبوتری پہ اس کا اتنا اثر پڑا کہ وہ گھونسلے سے نکل کر اپنے ننھے منے سرخ پنجوں پہ دوڑتی ہوئی کنگنی کے دوسرے کونے پر چلی گئی۔ پھر جب ادھر بانس پٹخایا تو وہ پھر اس طرف دوڑتی آئی۔ یوں جب کئی منٹ ہو گئے تو منی نے بانس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خود کنگنی پہ پٹخانا شروع کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا تھا۔ بانس زور سے مارا ہی نہ جاتا تھا مگر منی نے بے دھڑک زور زور سے پٹخانا شروع کر دیا۔ کبوتری بھی گھبرا گئی اور وہاں سے اڑی مگر دروازہ بند دیکھ کر پھر چکر کاٹتی ہوئی گھونسلے کے پاس کنگنی پہ آ بیٹھی۔ مگر منی کب دم لینے والی تھی۔ وہ وہاں سے پھر اڑی اور اب کے دوسری طرف سامنے کنگنی پہ جا بیٹھی۔ اس کا پوٹا کانپنے لگا تھا اور وہ اداس آنکھیں گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھیں۔ پٹختے ہوئے بانس سے گھبرا کر وہ ایک بار پھر اڑی اور گرڈر کے قریب چکر کاٹتے کاٹتے بیچ میں لٹکتے ہوئے پنکھے پر بیٹھ گئی۔ پنکھا ہلنے لگا جس سے وہ وہاں ٹک نہ سکی اور فوراً ہی وہاں سے اڑ کے پھر چکر کاٹتے شروع کر دیئے اور نیچے ہوتے ہوتے وہ روشندان میں آ بیٹھی اس کا پوٹا ہی نہیں' پورا

جسم، سرمئی پروں میں ڈھکا ہوا تھا وہ ننھا سا جسم کانپ رہا تھا اور چونچ کے کھل جانے سے اس کا پتلا سا سفیدی مائل سرخ تالو صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ منی نے بانس کو پھر جنبش دی اور کبوتری ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ پھر اڑی اور تھک کے نیچے کی طرف آنے لگی۔ نیچے آتے آتے وہ دیوار میں ایک کونے سے چمٹ گئی۔ دیوار پہ پھیلے ہوئے اس کے پر اور چمٹی ہوئی دم، اور ان میں ایک لہر، ایک کپکپاہٹ دوڑتی ہوئی۔ منی نے جلدی سے پھر بانس پٹخایا اور کبوتری دیوار سے الگ ہو، تھک کے نیچے آنے لگی میں تیار کھڑا تھا اس کے نیچے گرتے ہی اس کے سر پر جا پہنچا۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک ساتھ رک گئی اور گردن اور دم کو سکیڑ کے پوٹلی سی بن گئی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں داب لیا۔ منی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ بانس ایک طرف رکھ، اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور چلا کے بولی۔ ''اُجالے میں لے آؤ۔'' میں دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا ایک دھڑکتی ہوئی گرم چیز میرے ہاتھوں میں تھی سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی تارا سی آنکھیں، دھڑکتا دہکتا پوٹا، نرم نرم پر جن میں بجلی کی روسی دوڑ رہی تھی۔ میرا دل جانے کیوں دھڑکنے لگا اور مٹھی ڈھیلی پڑ گئی کبوتری ہاتھوں میں تڑپی اور ایک ساتھ اُڑ گئی۔ منی نے قہر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا ''چھوڑ دیا؟'' اس کی ڈانٹ سے میں سہم گیا۔ مجھے اپنی چوک کی سمجھ آ گئی تھی کبوتری منڈیر پہ جا بیٹھی تھی۔ شاید ابھی دم لے رہی تھی میں جلدی سے زینے کی طرف چلا۔ منی میرے پیچھے پیچھے، دوسری منزل کی چھت پہ پہنچ کے میں بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا منڈیر کی طرف چلا۔

میں بالکل قریب پہنچ گیا اور بس ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ کبوتری پھڑ پھڑا کے اڑ گئی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دل ڈوب سا رہا تھا۔ منی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اس نے اس طرح قہر میں ڈوبی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بغیر کچھ کہے سنے واں سے چلی گئی۔

میں نہ جانے کتنی دیر وہیں منڈیر پہ بیٹھا رہا۔ وہ پھٹے، ٹوٹے، ملگجے بادل جو دوپہر سے آسمان پہ رینگ رینگ کے چل رہے تھے اب جڑ جڑا کے گھٹا بن گئے تھے۔ میلی میلی، گھٹی گھٹی گھٹا، مجھے جاڑا لگنے لگا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتا، اونگھتا، رینگتا زینے سے نیچے اتر آیا اماں جی نے مجھے آنگن میں دیکھ لیا تو آواز دی۔ ''بیٹا جاڑے پالے میں کہاں پھر رہا ہے، اندر آ جا۔'' ٹھنڈی ہوا بھی چل پڑی تھی۔ مجھے اور جاڑا لگنے لگا۔ جب میں اندر

اماں جی کے پاس دہکتی ہوئی انگیٹھی کے سامنے جا کے بیٹھا ہوں تب مجھے پتہ چلا کہ میں کتنی ٹھنڈ کھا کے آ رہا ہوں۔ ایک دفعہ تو میری بتیسی بج اٹھی۔ تھوڑی دیر میں ہوا اور تیز ہوئی اور بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ امی جان! چھوٹے چاچا، بھائی جان سب اندر آ گئے تھے بھائی جان نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا پھر واپس آ کر انگیٹھی میں تھوڑے سے کوئلے اور جھونک دیئے، دہکتے ہوئے انگاروں پہ تھوڑی دیر کیلئے کالے کوئلوں کی تہہ چڑھ گئی مگر پھر وہ بھی اندر سے سرخ پڑتے چلے گئے اور انگیٹھی سے پھر سے ننھے ننھے سبزی مائل سرخ شعلے اٹھنے لگے۔

شاید میں اماں جی کے گھٹنے سے لگا لگا ہی سو گیا تھا۔ بہت رات کو بس ذرا کے ذرا میری آنکھ کھل گئی تھی، میں اپنے بستر میں تھا۔ اماں نے ہی مجھے بستر پہ ڈالا ہوگا۔ صبح کو جب میری آنکھ کھلی ہے تو اس وقت مجھے پتہ چلا کہ کنگنی کا وہ تنکوں سے سجا بنا کونہ سونا سونا تھا، اور خالی۔ کمرہ بھی خالی سا لگ رہا تھا۔ وہ ہلکا میٹھا شور جو نہیں تھا۔ پھر اماں جی فجر کی نماز کیلئے اٹھیں اور لوٹا اٹھا کے دروازے کی کنڈی کھول باہر نکلیں ان کے سر سے کوئی پھٹ پھٹ کرتا سرمئی سایہ نہیں گزرا۔ اماں جی کو دیکھو کہ پھر بھی انہیں خیال نہیں آیا۔ میں بہت دیر چپ چاپ پڑا سوچتا رہا کہ بات کیا ہوئی۔ کبھی گمان گزرتا کہ کہیں سبز پری والا قصہ نہ ہوا ہو۔ جیسے وہ کبوتری بن کے اڑ گئی تھی، غائب ہو گئی تھی، کبھی وہم ہوتا کہ کسی لونڈے نے غلیل سے گرا لیا ہو۔ پھر شک پڑتا کہ کیا خبر ہے آئی ہو اور ڈر کے واپس چلی گئی ہو میں اماں جی سے پوچھ تو لیتا مگر مجھے یہ ڈبکا لگا ہوا تھا کہ انہیں ہماری کل کی کارستانی کا پتہ نہ چل جائے۔ میں ڈر کے مارے دوپہر تک چپ رہا اور جان کر انجان بنا رہا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور ڈرتے ڈرتے اماں جی سے یہ پوچھ ہی لیا۔ میری بات سن کر انہیں اچانک خیال آیا کہ ہاں واقعی صبح کنگنی خالی پڑی تھی اور جب وہ لوٹا لیے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھیں تو ان کے سر کے اوپر سے کوئی سرمئی سایہ پھڑ پھڑاتا ہوا نہیں گزرا تھا اور پھر انہیں ایک ساتھ یاد آیا کہ شام کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا تھا اور اس خیال کے ساتھ وہ کسی سوچ میں پڑ گئیں یہی سوچ رہی ہوں گی کہ سید صاحب سے بے ادبی تو نہیں ہو گئی کہ خفا ہو کے واپس چلے گئے ہوں۔

دوپہر کو منی بھی آ گئی تھی۔ گئے دن کی خفگی تو یوں بھی اس کے ذہن سے اتر گئی ہو گی۔ کبوتری کے کھو جانے کا حال سنا تو ساری بات ہی بدل گئی۔ کبوتری کی تلاش میں ہم دونوں

پہلے اسی منڈیر والی چھت پہ گئے۔ خوب دیکھا بھالا۔ پھر دوسرے زینے پہ چڑھے اور سب سے اوپر والی چھت پہ پہنچ گئے۔ اِدھر دیکھا' اُدھر دیکھا۔ دور دور کے کوٹھوں پر نظر دوڑائی۔ بجلی کے کھمبوں اور تاروں کو تاکا۔ آس پاس کے املی اور نیم کے پیڑوں اور ٹہنیوں پہ نگاہ ڈالی مگر کبوتری کہیں نظر نہ آئی۔ وہ اونچا مندر جس کے گرداگرد اوپر کلس تک طاق ہی طاق بنے ہوئے ہیں اور جس کے ہر طاق میں ایک مورتی رکھی ہوئی ہے ہماری چھت پر سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ان طاقوں میں جنگلی کبوتروں کے جوڑے بیٹھے تھے۔ چند ایک کبوتر کلس کے اوپر دھوپ میں پوٹلی بنے اونگھ رہے تھے۔ بعضوں کو دیکھ کر تو ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی گردن ہی نہیں پھر ایک ساتھ کوئی کبوتر پھریری لیتا اور سرمئی بالوں کی گیند میں سے ایک چھوٹا سا سر' ایک ننھی سی چونچ ابھر آتی۔ ایک طاق میں دو کبوتر چونچ سے چونچ ملا رہے تھے۔ چونچیں ملتے ملتے ایک دوسرے میں جکڑ گئیں۔ دونوں کی آنکھیں بند ہوگئیں اور مجھے ڈر لگنے لگا کہ دونوں طاق سے اب گرے مگر چونچیں تھوڑی دیر میں الگ ہوگئیں۔ اِن اَن گنت کبوتروں میں ہماری کبوتری تو کہیں نہیں تھی۔ انہیں دیکھتے دیکھتے ہماری نظریں تھک گئیں اور ہم ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ مجھے منی کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی میں سامنے والے املی کے چھدرے پیڑ کو دیکھنے لگا جس پہ کٹاریں بہت دنوں سے لگنی بند ہوگئی تھیں اور جس پہ ہر وقت کوئی فاختہ' کوئی کوا بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی لمبی لمبی دموں والے طوطوں کی کوئی ڈار اُتر آتی اور آن کی آن میں شور مچاتی اڑ جاتی اور نہیں تو کوئی کتھئی پروں' سفید دھاریوں والی سل کھٹیا چپکے سے کسی ٹہنی پہ اتر آتی' بیٹھی رہتی' بیٹھی رہتی۔ پھر آپ ہی آپ چپ چاپ وہاں سے اڑ جاتی۔ سب سے اونچی سوکھی پھننگ پہ اچانک نیل کنٹھ بیٹھا دکھائی دیتا اور لگتا کہ نہ جانے کب سے بیٹھا ہے پھر جب ایک ساتھ ہماری نظر اٹھتی تو پھننگ خالی نظر آتی اور ہمیں بالکل اندازہ نہ ہوتا کہ کتنی دیر ہوئی کہ نیل کنٹھ اڑ گیا۔ مگر اس وقت تو سب ٹہنیاں خالی پڑی تھیں میں بس یونہی اسے دیکھ رہا تھا۔ منی دیر سے چپ بیٹھی تھی چپ بیٹھی رہی پھر ایک ساتھ ہولے سے بولی۔ ''تو نے اسے اڑا دیا؟''

''میں کیوں اڑاتا؟'' میں نے کھسیان پٹ سے کہا جیسے میں نے سچ مچ اسے اُڑایا ہو۔

''اور نہیں تو میں نے اڑایا ہے؟'' وہ تنک کے بولی۔

میں چپکا ہوگیا۔ وہ بھی چپ ہوگئی۔

ایک ساتھ پھر بولی ''نہیں اڑایا تو نے؟ کھائیو اللہ قسم۔''

''نہیں کھاتے'' میں چڑچڑا ہو چلا تھا۔

منی چپ ہوئی' پھر بولی۔ ''جس نے اڑایا ہے اس پہ عذاب پڑے گا۔''

''عذاب!'' میں ڈر گیا مگر منی نے کیا گناہ نہیں کیا تھا؟ میں نے فوراً جواب دیا ''عذاب اس پر پڑے گا جس نے اسے بانس سے نیچے گرایا تھا۔''

میرے جواب پہ منی کو ایسا تاؤ آیا کہ اس نے زور سے مجھے کہنی ماری اور غصے سے بولی۔ ''چل یاں سے۔''

مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اس کے بال پکڑ لیے۔ وہ مجھ سے بال چھڑانے لگی مگر میں کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اس نے مجھے کیوں مارا تھا۔ میں اس سے گتھم گتھا ہوگیا تھا مگر ایک ساتھ' جانے کیوں' میرا دل دھڑکنے لگا اور سارے بدن میں سنسنی دوڑنے لگی۔ میرے ہاتھ میں جیسے پھر...... وہ دھڑکتا دہکتا پوٹا' نرم نرم پر' جن میں بجلی دوڑ رہی ہو...... میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ مجھے جھٹک وہ ایک طرف جا کھڑی ہوئی۔ کالی چمکیلی کئی لٹیں اس کے گال پہ آ گری تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی تمکنت سے ہاتھوں سے بال سنوارے' مجھے گھورتی رہی۔ پھر ہولے سے بولی ''بدتمیز'' اور دھیرے سے زینے کی طرف واپس ہولی۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی زینے کے پاس پہنچی' ٹھٹھکی' میں سمجھا کہ مڑ کے دیکھے گی' گردن کچھ مڑی تو تھی مگر وہ مڑ کے دیکھے بغیر زینے میں اتر گئی۔

میں چھت پہ بہت دیر بیٹھا رہا۔ گم صم' مندر کے طاقوں میں کبوتر اسی طرح بیٹھے تھے' ستا رہے تھے' چونچوں سے چونچیں ملا رہے تھے۔ کوئی کالی کنٹھی والا کبوتر ایکا ایکی گردن پھلا کے کبوتری کے گرد چکر کاٹنے لگتا اور خوب گٹکتا۔ ایک ساتھ مندر کے پکے کنویں میں لوہے کے ڈول کا چھناکا ہوتا تو دونوں پھٹ پھٹ کرتے اڑ جاتے۔ مگر تھوڑا اونچا جا کر پھر نیچے آتے اور کسی طاق میں نئے سرے سے جگہ سنبھالتے۔ املی پہ ایک اکیلا کوا آ کے بیٹھا۔ پہلے تو اکیلا ہی چونچ کو خم دے کر کائیں کائیں کرتا رہا پھر شاید تھک کر چپ ہوگیا۔ پھر شاید چپ بیٹھے بیٹھے بھی اکتا گیا اور بغیر شور کیے کسی انجانی سمت میں اڑ گیا۔ املی کا خالی پیڑ اور وہ اِکا دُکا سوکھی مرنڈ کٹاریں

کہ نہ جانے کب سے اسی طرح لٹک رہی تھیں اک ذرا ہوا سے ہل اُٹھتیں اور پھر مردہ سی بن جاتیں۔ میں بیٹھا رہا‘ نہ جانے کیا سوچتا رہا‘ شاید کچھ بھی نہیں۔ سوچنے کے لئے کوئی بات ہی دماغ میں نہیں آتی تھی۔ خالی خالی سا تھا دماغ۔ ہماری چھت‘ دوسری منزل والی منڈیر‘ اور کنگنی۔ پھر میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ نہیں‘ بس اکتا گیا۔ کھڑے ہو کے انگڑائی لی اور بے دلی سے زینے کی طرف ہو لیا۔

شام کو اماں جی نے خاص طور پر کمرے کا دروازہ کھلا رکھا تھا۔ میں بہت دیر تک رستہ دیکھتا رہا کہ اب آتی ہوگی‘ اب آتی ہوگی مگر منڈیر خالی پڑی رہی۔ پھر منڈیر کی وہ جگہ جہاں ننھی ننھی سفید بیٹیں جن میں کہیں کہیں کالی چتی بھی تھی شام کی کالونس میں چھپتی چلی گئی۔ مجھے نیند آ گئی رات کو کئی دفعہ میری آنکھ کھلی۔ ہر دفعہ دروازہ کھلا دکھائی دیا اور کنگنی خالی۔ پھر مجھے خواب دکھائی دیا کہ جیسے میں نے کبوتری کو پکڑ لیا ہے اور وہ سبز پری بن گئی...... اور منی ہولے ہولے چلتی ہوئی زینے کے پاس پہنچی ہے‘ ٹھٹکی ہے اور بغیر مڑے اندھیرے زینے میں اتر گئی ہے...... میں جاگ پڑا۔ تڑکے کا وقت تھا دروازہ اسی طرح کھلا پڑا تھا اور کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ کنگنی سونی پڑی تھی اور وہ خالی گھونسلہ ٹھنڈا برف لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

پٹ بیچنا

اجو نے ایک مرتبہ پھر انہیں گنا‘ وہ واقعی چھ رہ گئے تھے۔ وہ پریشان تھا کہ آخر ساتواں کہاں گیا اسے ساری محنت کا خیال آ رہا تھا کن کن مصیبتوں سے آنگن میں سے چپ چپ کرتی گیلی گٹھلیاں کیاری میں جمع کیں۔ ان پر راکھ ڈالی۔ ساتویں دن جب راکھ کا رنگ بے رنگ ہو گیا تو ان پر پانی چھڑکا۔ نہ جانے کتنے دنوں تک روز سویرے سویرے اور دن ڈھلے گھڑے سے لوٹے میں پانی بھرنا اور میلی راکھ میں لسی ہوئی گٹھلیوں پر چھڑکنا۔ کافی دنوں تک وہ مردہ سی پڑی رہیں جیسے ان میں دم ہی نہیں ہے۔ لیکن ایک روز اچانک ایک گٹھلی کونے کی طرف سے پھٹی دکھائی دی پھر دوسری گٹھلیوں کی بھی صورت بدلنے لگی‘ اور پھر ایک روز چکنی چمکتی ہوئی زرد دراڑ میں کچھ کالی کچھ اودی ایک گھنڈی سی نظر آئی وہ دراڑ چوڑی ہوتی گئی اور گھنڈی باہر نکلتے نکلتے لام سا بننے لگی پھر اور کلے پھوٹے‘ کلے بڑے ہوئے‘ کلوں سے کونپلیں نکلیں۔ ننھی منی عنابی پتیاں جو پھیلتی گئیں‘ لمبی ہوتی گئیں اور لمبی لمبی لہلہاتی عنابی پتیوں کی چھتریاں تن گئیں یا پپیئے کے پودوں کا جھرمٹ جن کے پتے عنابی پڑ گئے تھے۔ اس نے ان کی ایسی دیکھ بھال کی جیسے وہ کوئی آموں کا باغ ہے۔ باغ سا تو وہ لگتا ہی تھا‘ ننھا منا باغ‘ جہاں کوئی باغ کے قریب آیا‘ اس نے شور مچایا۔ آمنہ کی بات پہ وہ موم ہو جاتا تھا مگر پپیوں کو وہ بھی ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی۔ سبو تو خیر پاس بھی نہیں پھٹک سکتی تھی۔ اس نے خود بھی ابھی تک ایک پپیا بھی نہیں اکھاڑا تھا۔ جی روز للچاتا تھا لیکن روز جی کو مارتا اور اگلے دن کے لئے بات اٹھا رکھتا۔ آج سویرے بھی چھڑکاؤ کے وقت جب پانی کے چھینٹوں سے عنابی پتوں میں لہک سی پیدا ہوئی تھی تو اس کا جی تلملانے لگا کہ ایک پپیا توڑے اور بجانا شروع کر دے مگر وہ نرم اور ملائم پتوں پہ انگلیاں پھیر کے ہی رہ گیا پھر روز کی طرح ایک بار پھر گنا اور مطمئن ہو گیا۔ سات پپیے......

صبح چھڑ کاؤ کے وقت تو سات تھے مگر اس وقت ایک غائب تھا۔ کہاں گیا؟ شاید آمنہ نے اکھاڑ لیا ہو۔ اس نے شک بھری نظروں سے آمنہ کو دیکھا جو ہل ہل کر اپنا سبق یاد کر رہی تھی۔

(وَیْلٌ لِکُلِّ ھُمَزَۃٍo نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَہٗ)

اس کے انہماک کو دیکھ کر اس کا شک آپ ہی آپ مٹنے لگا پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''آمنہ تو نے میرا پیپا توڑا ہے؟''

آمنہ پڑھتے پڑھتے ایک ساتھ رک گئی۔ ہلنا بھی بند ہو گیا۔ ''کیا؟'' اس نے چونک کے پوچھا۔

''پیپا توڑا ہے تو نے؟'' اس نے اپنی بات دوہرائی۔

اس نے تنک کر جواب دیا ''میں کیوں توڑتی؟''

اس کا سارا شک جاتا رہا مگر پھر کس نے توڑا ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آمنہ نے پھر ہل ہل کر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

(وَیْلٌ لِکُلِّ ھُمَزَۃٍo نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَہٗ)

مگر ہلتے ہلتے وہ ایک ساتھ پھر رُکی' شک بھری نظروں سے سبو کو دیکھا جو ہجے کر کے سبق پڑھ رہی تھی۔

''واو...... ی...... زَبَر...... ''وے''...... ''لام...... دو...... پیش...... اُن''...... وَیلٌ''...... لام...... زیر...... ''لے''...... ک لام پیش...... کُل...... وَیْلٌ لِکُلِّ۔''

آمنہ نے اسے ٹوک دیا۔ ''سبو! تو نے توڑا ہے؟''

سبو ٹھٹک گئی۔ پھر مری سی آواز میں بولی۔ ''میں کیوں توڑتی؟...... میں نے نہیں توڑا......'' اور پھر رُک رُک کر ہجے کرنے لگی۔

''واؤ...... ی...... زبر...... ''وے''...... لام دو پیش......''

مگر اب اس کی آواز کچھ اور بیٹھ گئی تھی۔ اجو چوکنا ہو گیا کہیں سبو ہی نے تو نہیں توڑا ہے؟ اس نے بڑے شک اور غور سے اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح مٹھس بنی سیپارے پہ نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ اجو کو سبو ہمیشہ بدرنگ گوبرسی لگی کالی نہ سہی مگر لگتی تھی کچھ کالی کچھ میلی کہ بال سوکھے سوکھے' کپڑے میلے ملگجے' ناک میں نیم کا کڈھب سا تنکا' اوپر سے کوڑ مغز' ہمیشہ سبق سناتے ہوئے اٹکنا' اور بوا جی سے بھد بھد پٹنا' پٹنا اور اسی طرح ڈھیٹ بنے بیٹھے رہنا اور غلط

سلط ہجے کرتے رہنا۔ رونا وہ شاید جانتی ہی نہ ہو یا اس کی کمر کمر نہیں لکڑی کا تختہ ہو گی جو خود نہیں دکھتی تھی۔ بلکہ بوا جی کے ہاتھوں کو دکھا دیتی تھی۔ پھر چوٹی بھی تو تھی۔ اجو کو اس کی کئی چوریاں یاد آ گئیں' ایک دفعہ اس کا لٹو اس نے اپنے نیفے میں چھپا لیا تھا لیکن جب وہ چھٹی کے بعد جزدان بغل میں داب کے چلی تو دروازے میں پہنچ کر لٹو نیفے سے گر پڑا اور اس کی چوری کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ وہ شیشے کی گول بھاری دوات' جو وہ بڑے شوق سے بازار سے لایا تھا اور جو دوسرے دن ہی غائب ہو گئی تھی اصل میں سبو ہی نے تو چرائی تھی۔ آمنہ کو اس دن اس کا نیفہ پھولا پھولا نظر آیا تھا' مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ دوات چرا کر لیے جا رہی ہے۔ نہیں تو وہ اسی وقت اس کی چوری کھول دیتی پتہ تو اس وقت چلا جب اس نے شور مچایا کہ اس کی دوات کھو گئی ہے۔

وہ اسے بار بار تکتی تھی اجو بھی اسے تکتا رہا۔ مگر وہ اسی طرح سیپارے پہ جھکی ہجے کیے جا رہی تھی۔ اجو نے گرما کے پوچھا۔

''سبو کی بچی' اگر توڑا ہو تو بتا دے۔''

''میں نے ......نہیں توڑا۔'' اس نے ہولے سے کہا اور پھر اٹک اٹک کے سبق پڑھنے لگی۔ آمنہ نے ایک ساتھ اس کے نیفے پہ ہاتھ ڈالا ''یہ کیا ہے' دکھائیو۔''

سبو نے اس کا ہاتھ بہت جھٹکا لیکن آمنہ نے بھرپور وار کیا تھا پیپا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اجو پیپا دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ پر اسے سبو پر بہت غصہ آیا۔

پیپا چھین کے جب وہ چارپائی کے بانوں پر گھس رہا تھا تو آمنہ نے اسے بار بار للچائی نظروں سے دیکھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا کہنے لگی۔

''ارے! اس پہ نہیں گھسے گا۔''

اجو خود مایوس ہوتا جا رہا تھا اسے تکنے لگا ''پھر؟''

''آؤ چلیں زینے پہ'' آمنہ بولی! ''اس کے کواڑ کھردرے ہیں' اس پہ گھسیں گے۔''

اجو اور آمنہ دونوں زینے پہ جا پہنچے۔ اب پیپا آمنہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور بڑے انہماک سے پیپے کو کھردرے کواڑ پہ گھس رہی تھی جیسے ہل ہل کے سبق یاد کر رہی ہو۔

''وَے لُلّے کُلّے ھُوْ مَزَتِ الّذِی''...... وے لے کُلّے ھُوْ مِزَت الذی'' سبق آمنہ فرفر پڑھتی تھی' فرفر سناتی تھی مگر یہ تو بوا جی جانیں اسے تو وہ اس لئے اچھی لگتی تھی کہ اجلی رہتی تھی

اور جیسے وہ سفید چمکیلے بندے گورے کانوں میں ہلکورے کھاتے تھے ایسے ہی وہ ہلکورے کھاتی تھی۔ جیسے سبق یاد کرنے میں' بوا جی کا مسالہ پینے میں' جھاڑو دینے میں۔ گھستے گھستے وہ رُکی' منہ میں پپیا رکھ کے بجایا' پپیا واقعی بولنے لگا تھا۔ اجو کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے تقاضا کیا۔ ''میں بھی بجاؤں گا'' آمنہ نے اپنے پتلے پیازی ہونٹوں میں رکھ کے اسے ایک دفعہ پھر بجایا اور پھر اسے دے دیا اور جب اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پپیا ہونٹوں میں' پھوکے سے دبا کر بجانا شروع کیا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے میٹھے سروں سے بھری بانسری اس کے ہونٹوں میں دبی ہو اور وہ اس کی تان کے ساتھ اڑتا اڑتا زینے سے نکل کر کوٹھے والی کھلی چھت پہ پہنچ گیا ہو۔ بلکہ چھت سے بھی اونچا پہنچ گیا ہو۔

دونوں خاصی دیر تک زینے کی سیڑھیوں پہ بیٹھے رہے دونوں ہی بھول گئے تھے کہ پپیا ہے کس کا۔ باری باری بجائے جا رہے تھے پھر وہ بے سوچے سمجھے آپ ہی آپ اٹھے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ زینے سے نکل کے چھت پہ پہنچے اور منڈیر پہ جھک کر نیچے آنگن میں جھانکا سبو اسی طرح سیپارے پہ جھکی بیٹھی تھی اس نے زور سے آواز دی ''سبو چوٹ ٹی'' دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑے سبو اسی طرح سیپارے پر جھکی رہی۔

''سبو چوٹ ٹی'' اجو نے ایک مرتبہ پھر آواز لگائی۔ دونوں پھر کھلکھلا کے ہنس پڑے۔

آمنہ کو پپیا بجاتے بجاتے دیر ہو گئی تو اجو نے لے لیا۔ دونوں ہل ہل کے اسی طرح بجاتے رہے جیسے بانسری بجا رہے ہوں' جیسے ہل کے زور زور سے سبق یاد کر رہے ہوں۔

جب وہ واپس نیچے آئے تو ایک مرتبہ پھر آمنہ نے اجو کے ہاتھ سے پپیا لے لیا اور سبو کے کان کے پاس لے جا کے زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔

اجو لہک کے بولا ''سبو چوٹ ٹی......''

دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ سبو گم متھان بنی بیٹھی رہی جیسے گوبر کا چوتھ ہو۔

اتنے میں بوا جی اندر سے نکل آئیں۔ ''لونڈیو! سبق یاد کر لیا؟''

سبو کی ایکا ایکی ہچکیوں کی آواز آنے لگی۔ اجو اور آمنہ دونوں سناٹے میں آ گئے۔

''اری کیا ہوا تجھے؟'' بوا جی زور سے بولیں۔

جواب ندارد۔ میلی پوٹلی میں سے ہچکیوں کی آواز آئے چلی جا رہی تھی۔

اجو کا خون خشک ہو گیا۔ کہیں سبو نے کہہ دیا تو بوا جی مار مار کے کچومر نکال دیں گی۔

آمنہ بھی ڈر رہی تھی......

بوا جی پوچھنے لگیں۔ ''اری کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

پھر ایک ساتھ آمنہ سے مخاطب ہوئیں۔ ''آمنہ تو نے اس سے کچھ کہا ہے؟''

''میں کیوں کہتی۔'' آمنہ گھبرا کے بولی۔ ''میں نے اللہ قسم کچھ بھی نہیں کہا۔ اجو کہہ رہا تھا۔''

بوا جی کی غصیلی نظریں اجو کی طرف اٹھ گئیں۔ ''کیوں رے'' اجو کا دم نکل گیا۔

سہمی سہمی آواز میں بولا۔ ''اللہ قسم! بوا جی میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

''کیوں ری بتاتی کیوں نہیں؟'' بوا جی نے سبو کو بری طرح ڈانٹا۔

ہچکیوں میں سے ایک آواز پیدا ہوئی۔ ''آمنہ چھیڑتی ہے۔''

ہاتھ کا پنکھا پاس ہی پڑا تھا بوا جی نے آمنہ کی کمر پہ تاڑ تاڑ دو رسید کیے۔ پھر سبق سنا۔ آمنہ نے فر فر سبق سنا دیا۔ بوا جی بولیں ''جاؤ چھٹی ہے۔ سبو! تو نے یاد کیا؟''

سبو کی ہچکیوں کی آواز ہجوں میں بدلنے لگی ۔ ہجے ہچکیاں' ہجے ہچکیاں' بوا جی اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''یاد نہیں ہے ابھی۔ جلدی یاد کر شام ہو رہی ہے۔''

شام ہو چکی تھی اندھیرا آنگن اور اندھیرا ہو گیا تھا۔ بوا جی باورچی خانے میں جا بیٹھیں جہاں سے دیگچی میں سالن بھننے کی آواز آ رہی تھی۔ آمنہ جزدان باندھ بغل میں رکھ دروازے کی طرف چلی۔ دروازے پہ پہنچ کر وہ رُکی۔ مڑ کے بولی ''سبو ہم جا رہے ہیں۔''

سبو اسی طرح بیٹھی رہی۔ آمنہ خوش خوش باہر چلی گئی۔

اجو چپ کھڑا رہا۔ سبو کو دیکھتا رہا۔ سبو نے میلے آنچل سے آنکھیں پونچھ لی تھیں' جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی ارد گرد کی جگہ سرخ پڑ گئی تھی اجو کو لگ رہا تھا کہ جیسے گوبر میں کوئی پٹ بیجنا چمک رہا ہو۔ اسے اپنے کیے پہ ندامت ہو رہی تھی۔ کیوں چھیڑا تھا اسے آمنہ کی بچی نے۔ کیا تھا سب کچھ خود' پھر خود تو بچ گئی' بوا جی سے میرا نام لے دیا' وہ آہستہ سے چارپائی پہ آ بیٹھا تھا۔ بیٹھا رہا' پھر سرکنے لگا سرکتے سرکتے بالکل سبو کے برابر آ گیا پھر پپیا بجا کے متوجہ کرنا چاہا مگر پپیا فش فش کر کے رہ جاتا جیسا سبو آیت کے ہجے کر رہی ہو۔

''سبو! ہمارا پپیا نہیں بولتا......ٹھیک کر دے۔''

سبو اسی طرح بیٹھی رہی......

''اچھا نہیں ٹھیک کرے گی؟ کٹ ہوگئی' ہم سے؟'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

سبو ایک ساتھ متوجہ ہوگئی۔

اجو سے پپیا لے کر اس نے پٹی پہ کسے ہوئے بانوں پہ گھسا۔ پھر منہ سے بجا کے دیکھا اور جب اس کی رک رک کر نکلتی ہوئی آواز تیز ہموار نہ ہوئی تو اس نے پتھر پہ گھسا اور پھر منہ سے بجایا۔ اجو بڑے انہماک سے پپیے پر ہوتے ہوئے عمل کو دیکھتا رہا۔ سبو کے میلے میلے کپڑوں اور ملگجے بالوں کو وہ بھول ہی گیا تھا اس کے چہرے پر اس کی نظریں بار بار پڑتی تھیں مگر اس وقت تو اس کا چہرہ بھی میلا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دوباری میں ہلکی سی آہٹ ہوئی اور آمنہ ایک ساتھ دروازے میں آ کھڑی ہوئی......

''اچھا اجو؟'' اس کی آواز میں شکایت کا رنگ بھی تھا اور طعنہ کا بھی۔

اجو ہڑ بڑا کر سبو سے مخاطب ہوا...... ''لاؤ بھیا ہمارا پپیا'' اور اس نے جلدی سے ہاتھ سے پپیا لے لیا۔

''اجو ہمارے ساتھ بزریا نہیں چلے گا' پان لینے؟''

آمنہ نے ایسے للچا دینے والے لہجے میں کہا کہ اجو کے قدم بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ گئے۔

سبو پھر سیپارے پر جھک گئی۔

''واؤ ی زیر وے، لام دو پیش ''لُن'' ...... وے لُن ...... لام زیر ''لے'' ویلُٹے...... ک لام پیش 'کُل' ...... لام زیر ''لے'' وے لُئے کُلتے۔''

پٹ بیجنا دم بھر کو چمکا' چمک کے غائب ہوگیا۔ گوبر کے گند سے نکلا' گوبر کے گند میں ہی گم ہوگیا۔ گلی سے پپئے کی سریلی چمکیلی آوازیں آ رہی تھیں اور سبو اسی طرح اٹک اٹک کے پڑھ رہی تھی۔

وی زیر وے۔ لام دو پیش لُن ...... ''واؤ۔'' ''ی'' ۔ زیر'' وے'' لام دو پیش لُن'' ویل'' ...... لام زیر لے ...... وے لے'' ک لام پیش'' کل'' ...... لازم زیر'' لے'' ...... وے لُئے کُلّے ......!!!

☆......☆......☆

پسماندگان

ہاشم خان اٹھائیس برس کا کڑیل جوان' لمبا تڑنگا' سرخ و سفید جسم' آن کی آن میں چٹ پٹ ہوگیا۔ کم بخت مرض بھی آندھی دھاندی آیا۔ صبح ہلکی ہلکی حرارت تھی شام ہوتے ہوتے بخار تیز ہوگیا۔ صبح جب ڈاکٹر آیا تو پتہ چلا کہ سرسام ہوگیا ہے۔ غریب ماں باپ نے اپنی سی سب کچھ کر ڈالی دن بھر میں حکیم ڈاکٹر سے لے کر پیروں' فقیروں تک سب کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔ لیکن دوا دارو نے اثر کیا نہ تعویذ گنڈے کام آئے۔ پھر رات ہوئی حالت بگڑ گئی اور ایسی بگڑی کہ صبح پکڑنی دشوار ہوگئی۔ ماں باپ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی اور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ کسی طرح صبح ہو جائے۔ ان کی دعا قبول ہوئی تو سہی' مگر ادھر صبح کا گجر بجا ادھر مریض نے پٹ سے دم دے دیا۔ آناً فاناً مرنے والوں کی خبر بھی آناً فاناً پھیلتی ہے۔ سارے محلے میں تہلکہ پڑ گیا۔ جس نے سنا سناٹے میں آ گیا۔ حلیمہ بوا کے گھر یہ خبر بہو نے پہنچائی۔ دہلیز میں قدم رکھتے ہی بولی۔ ''اجی حلیمہ بوا قہر ہوگیا ہاشم ختم ہوگیا'' حلیمہ بوا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہے ہے'' حلیمہ بوا اس وقت چولھے پر بیٹھی بچوں کے ناشتے کے لئے روٹی ڈال رہی تھیں مگر ہاتھ کا پیڑا ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ فوراً توا الٹا' چولھے کی آگ ٹھنڈی کر دی۔ کلثوم کی خانصاحبنی سے ایسی لڑائی تھی کہ آپس کا بھاجی بخرا بھی بند تھا۔ چنانچہ کلثوم کی بیٹی کا جب بیاہ ہوا تو خانصاحبنی نہ تو بیاہ میں بیٹھیں اور نہ بارات کا میوہ لیا۔ مگر ہاشم خان کی خبر سن کر کلثوم اگلی پچھلی ساری لڑائیاں بھول گئی۔ فوراً بولی۔ ''موت کا منہ کھلا ہے' بی بی میں ضرور جاؤں گی۔'' یہ کہہ چادر اٹھا فوراً خانصاحبنی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ صوبیدارنی بھی خبر سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں مگر پھر انہیں کچھ خیال آیا۔ صوبیدار صاحب کو مردانے سے بلوا کر ہدایت کی کہ اس وقت کی روٹی ہماری طرف سے ہوگی' اس کا انتظام کرواؤ۔ میں جا رہی

ہوں۔'' پھر انہوں نے چلتے چلتے نوکرانی کو بھی ہدایت کر ڈالی کہ ''اری دیکھ ری۔ رات کی روٹیئیں رکھی ہیں لونڈے کو بھوک لگے تو تو گھی بورا سے اسے روٹی کھلا دیجو۔''

صوبیدارنی نے خانصاحبنی کے گھر کا راستہ عجلت سے لیکن خاموشی سے طے کیا۔ انہوں نے ان عورتوں کی تقلید مناسب نہ سمجھی جنہوں نے مردوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے گلی ہی سے اپنے جذبات کا دبا دبا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ہاں دہلیز نانگھنے کے بعد ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے بین صرف چند لمحوں تک سنے جا سکے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا اس میں صوبیدارنی کیا' کسی کی آواز بھی الگ سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا لیکن باہر اسی قدر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک میں کرسیاں اٹھا دی گئی تھیں' اب وہاں صرف جاجم بچھی ہوئی تھی' ایک شخص خاموش بیٹھا کفن سی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو حزن و ملال کی کیفیت تھی نہ اطمینان کی جھلک۔ ایسی جاندار چیزیں بھی ہوتی ہیں جو ہر دم ایک نئی کیفیت پیدا کرتی ہیں سفید لٹھا عید کی چاند رات کو درزی کی جس دکان اور جس گھر میں نظر آتا ہے اس سے حرکت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کا کفن سلتا ہے تو سفید غبار کی طرح نظر آتا ہے۔ بیٹھک میں سب سے نمایاں چیز تو یہ کفن ہی تھا ویسے اس سے الگ ایک کونے میں خانصاحب گھٹنوں میں سر دیئے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اِکا دُکا اور لوگ بھی وہاں نظر آ رہے تھے لیکن زیادہ لوگوں نے بیٹھک سے باہر گلی ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا تھا۔ دبی دبی آواز میں گفتگو ہوتی اور خود بخود ختم ہو جاتی۔ پھر کوئی نیا شخص گلی میں داخل ہوتا' آہستہ سے کسی کے پاس جا کھڑا ہوتا' سرگوشی کے انداز میں کچھ سوال کرتا' کچھ غم اور حیرت کا اظہار کرتا اور پھر چپ ہو جاتا۔ صوبیدار صاحب سب سے الگ بیٹھک کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھے کسی سوچ میں گم تھے۔ بیٹھک کے سامنے ذرا ہٹ کے ایک دوسرا مکان تھا جس کے پتھر پر باقر بھائی اور تجمل بیٹھے بڑے سنجیدہ انداز میں ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے ان کے انداز گفتگو نے علی ریاض کو کئی مرتبہ للچایا تھا۔ لیکن ان کے پاس جانے کا اسے کوئی بہانہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ جب چھنوں میاں وہاں پہنچے تو ہمت کر کے وہ بھی آہستہ سے ادھر ہو لیا۔
چھنوں میاں ہاشم کی خبر سن کر گھر سے بہت لپک کے چلے تھے لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی ان کی رفتار دھیمی پڑ گئی شاید انہیں اپنے قدموں کی آہٹ سے بھی کچھ الجھن ہو رہی تھی۔ چھنوں

میاں جب تجمل اور باقر بھائی کے پاس پہنچے تو اس وقت تجمل ہاشم خان کے تھانیداری کے انتخاب کا ذکر کر رہا تھا۔ ''ہاشم خان کی چھاتی تھی' غضب تھی مجھ سے تو دو اس میں سما جائیں' بس باقر بھائی سمجھ لو کہ سپرنٹنڈنٹ نے جو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔''

علی رضا آہستہ سے بولے۔ ''کیا خبر ہے بھائی' اسی کی نظر لگ گئی ہو۔''

''ہاں آں' کیا خبر ہے۔'' تجمل نے تائید کی۔

باقر بھائی دھیمے سے لہجے میں بولے۔ ''سب کہنے کی باتیں ہیں موت کا بہانہ ہوتا ہے ۔(کُلُّ نَفسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت)''

چھنوں میاں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''کیا خدا کی قدرت ہے؟''

باقر بھائی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے اکڑوں بیٹھے تھے ان کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں اسی کیفیت میں بیٹھے بیٹھے پھر بولے۔ ''آدمی میں کیا رکھا ہے' ہوا کا جھونکا ہے' آیا اور گیا۔''

علی ریاض کی آنکھوں میں ایک تحیر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ''باقر بھائی! کیا ہوتا ہے یہ' آدمی اچھا خاصا بیٹھا ہے ہچکی آئی' پٹ سے دم نکل گیا۔ جا رہا ہے' ٹھوکر لگی آدمی ختم' کچھ عجب کرشمہ ہے۔''

باقر بھائی سوچتے ہوئے بولے ''بس بھائی سانس کا ایک تار ہے۔ جب تک چلتا ہے' چلتا ہے' ذرا ٹھیس لگی' تار ٹوٹا' آدمی ختم''

تجمل اور چھنوں دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحوں تک علی ریاض بھی چپ رہا' مگر وہ بولا بھی تو کچھ اس انداز سے گویا خواب میں بڑبڑا رہا ہے ''زندگی کا کیا بھروسہ' آنکھ بند ہوئی' کھیل ختم...... کیا ستم ہے' ادھر نوکری کا پروانہ آیا' ادھر موت کا تار برقی آ گیا' اس کے بھید وہی جانے' عجیب کارخانہ ہے اس کا ......'' اور پھر علی ریاض بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ علی ریاض اور چھنوں میاں دونوں بت بنے ہوئے تھے۔ باقر بھائی بدستور ہاتھوں میں سر تھامے کہنیاں گھٹنوں پہ ٹیکے بیٹھے تھے مگر ان کی آنکھیں شاید اب بند ہوتی جا رہی تھیں۔ علی ریاض پھر چونکا اور یکا یک باقر بھائی سے مخاطب ہوا ''باقر بھائی! یہ خدا ہے بھی یا نہیں۔''

باقر بھائی نے اپنی آنکھیں کھولیں ''بھائی میرے ......'' وہ رُکے اور پھر بولے۔

"موت ہی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ خدا ہے۔"

علی ریاض باقر بھائی کی صورت تکتا رہا' تکتا رہا' پھر خیال کی نہ جانے کونسی دنیا میں پہنچ گیا۔ تجمل اور چھنوں میاں بھی کسی خیال میں گم تھے اور سامنے بیٹھک کی دہلیز پر صوبیدار صاحب اسی ایک زاویے سے بیٹھے تھے۔ بولنے کی ضرورت انہیں جب بھی پیش آئی' انہوں نے زیرلب کوئی مختصر سا فقرہ کہا اور چپ ہو گئے۔ لوگ خاصے جمع ہو گئے تھے' گلی پھر بھی خاموش تھی۔ آنے جانے والے بدستور اپنے قدموں کی آہٹ سے خوفزدہ تھے۔ پھر چھنوں میاں نے گھٹنے سے اپنی ٹھوڑی اٹھائی اور ایک نیم محسوس سے انداز میں پھریری لیتے ہوئے بولے "صاحب مجھے تو یقین نہیں آتا" چھنوں میاں چپ ہو گئے' خاموشی پھر چھا گئی۔ باقر بھائی اسی طرح بے حس وحرکت بیٹھے تھے البتہ علی ریاض اور تجمل نے ان کی طرف دیکھا مگر کچھ بولے نہیں چھنوں میاں کی زبان سے ایک فقرہ نکلا "بار بار اس کی شکل آنکھوں کے سامنے آتی ہے یقین نہیں آتا کہ وہ مر گیا۔"

"یقین کیسے آئے یار" تجمل آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "اترسوں تک تو اچھا بھلا تھا بازار میں مجھ سے مڈبھیڑ ہوئی میں پوچھنے لگا۔ "ہاشم خاں کب جارہے ہو نوکری پر۔ بولا "یار تقرری تو ہو گئی ہے اس ہفتے میں چلا ہی جاؤں گا۔"

علی ریاض نے ٹھنڈا سانس لیا "ہاں غریب چلا ہی گیا"

چھنوں میاں نے علی ریاض کے فقرے پر دھیان نہیں دیا وہ تجمل سے مخاطب تھے۔

"بھئی پچھلی جمعرات کو میں اور وہ دونوں شکار کو گئے ہیں" شکار کے لفظ کے ساتھ ساتھ مختلف انمل بے جوڑ تصویریں چھنوں کی آنکھوں کے سامنے ابھر آئیں۔ پھریری لے کر بولے "کیا نشانہ تھا نیک بخت کا' صبح کی دھند میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا' قازیں ہڑبڑا کر اٹھی ہیں 'پروں کی پھڑپھڑاہٹ پہ دھوں سے گولی چلا دی' اور قازیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ اب اسی دفعہ کا ذکر ہے' صاحب۔ مجھے تو پتہ نہیں چلا کہ ہرنی کدھر سے چلی۔ بندوق کو تانتے ہوئے بولا "وہ ہرنی چلی" میں نے کہا کہ بہت دور ہے' مگر وہ بھلا مانس کہاں سنتا تھا۔ دَن سے گولی چلا دی۔ ہرنی بیس قدم گرمی میں چلی اور پھر لڑکھڑا کے گر پڑی" چھنوں میاں چپ ہو گئے پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے "وقت کی بات ہے بعض وقت منہ سے ایسی آواز نکلتی ہے کہ پوری ہو

کر رہتی ہے۔ شکار سے واپسی میں کہنے لگا۔ "چھنوں میاں اپنا یہ آخری شکار تھا' اب ہم چلے جائیں گے" غریب سچ مچ چلا گیا۔"

باقر بھائی کے جسم کو آخر جنبش ہوئی۔ سوچتے ہوئے بولے۔ "جمعرات کا دن تھا...... وقت کیا تھا؟"

علی ریاض کی آنکھیں باقر بھائی کے چہرے پہ جم گئیں۔ چھنوں میاں کچھ ڈرتے ڈرتے دھیرے سے بولے "شام...... ہاں شام ہو گئی تھی۔ جھٹپٹا سا تھا......"

علی ریاض اور تجمل دونوں باقر بھائی کو تکنے لگے۔ باقر بھائی اک ذرا تامل سے ہچکچاتے ہوئے بولے "ایسے وقت میں جانور کو نہیں مارنا چاہیے۔"

آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے قدموں کے افسردہ شور سے ساری بزریا میں ایک خاموشی چھا گئی۔ کالے پنواڑی کی دکان پر جو قہقہے بلند ہو رہے تھے وہ ایکا ایکی بند ہو گئے۔ سامنے کے کوٹھے والی نکٹی پہاڑن کے سلسلے میں شبراتی کے ذہن میں ایک بہت پھڑکتا ہوا فقرہ آیا تھا' اسے اس اچھے فقرے کا گلا گھونٹ دینا پڑا۔ سامنے ایک سائیکل سوار گزر رہا تھا۔ میت کو دیکھ کر وہ بھی سائیکل سے اتر پڑا۔ شمی حلوائی اس وقت موتی چور کے لڈو بنا رہا تھا اس کے ہاتھ یک بیک رک گئے تھے اور آنکھوں میں ایک حیرت' ایک افسردگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ملاں پنساری کے اعصاب پر مذہب سوار تھا۔ شاید اسی لئے وہ موت کی سنجیدگی سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ بدھیا کو تین پیسے کا دھنیا تولتے تولتے وہ ایک ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور جب تک جنازے کو کندھا دینے کا ثواب حاصل نہ کر لیا پلٹ کر نہیں آیا۔ یوں تو اس نے واپس آتے ہی کام میں لگ جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر بدھیا کے بھی آخر کچھ روحانی مطالبات تھے۔ ملاں کے واپس آتے ہی اس نے سوال کیا۔ "بھیا رے یو کس کی میت تھی؟"

ملاں نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "خاں صاحب ہیں ناوے' ان کو لونڈا گزر گیا۔"

بدھیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں "ہائے اللہ۔"

ہیرا سنار ابھی ابھی گلال لینے کی نیت سے دوکان پہ پہنچا ہی تھا خان صاحب کا نام سن کر وہ چونکا "کھانصاحب جی کا پتر......؟ وا مر گئیو؟ بڑی گھنٹا ہو گئی......" پھر ذرا تامل سے بولا

’’واکی دئ تو بڑی بنی ہوئی تھی‘ کیسے مرگیو؟‘‘

ملاں نے پھر ٹھنڈا سا سانس لیا ’’ماہراج موت بڑی بلوان ہے‘ وہ بوڑھے جوان کسی کو نہیں چھوڑتی۔‘‘

ہیرا بھی بہک نکلا۔ ’’ملاں یو تو سچ کیوے ہے موت تو جوگیوں اور رشیوں کو بھی آئی ہے اور شکتی مان راجوں مہاراجوں کو بھی آئی۔ راجہ کنش او یک چتر بنو تھا‘ پر موت نے وا کو بھی داب ہی لیو۔‘‘

ملاں کے لہجے میں اب توانائی پیدا ہوئی‘ ’’لالہ وہ رشی منی ہوں یا پیر پیغمبر ہوں‘ موت نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ سنیں ہے کہ افلطون نے ایک بوٹی تیار کی۔ اپنے شاگرد سے مرتے وخت کہا کہ مجھے دفن مت کریو یو بوٹی لے۔ چراغ میں ڈال کر میرے سرہانے چالیس دن تک جلائیو چراغ بجھنے نہ پائے۔ چالیسویں دن میں اٹھ کھڑا ہوں گا مگر چالیسویں دن کیا ہوا کہ شاگرد کی آنکھ لگ گئی اور چراغ بجھ گیا افلطون مرا کا مرا رہ گیا...... تو لالہ موت بڑی ظالم ہے۔‘‘

ہیرا کا سر جھک گیا۔

بدھیا کے لہجے میں افسردگی پیدا ہوگئی۔ ’’ہاں بابا موت پہ کسو کا کیا بس ہے۔‘‘ بدھیا چپ ہوگئی‘ مگر جب کوئی کچھ نہ بولا تو ایک فقرہ بھی اس کی زبان سے نکل گیا۔ ’’خانصاحبنی کے دونوں کڑیل جوان گئے...... اس کے غضب سے ڈرتا ہی رہے۔‘‘

ملاں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا ’’میاں وہ امتحان لیوے ہے۔‘‘

شبراتی نہ جانے کس لہر میں کالے کی دوکان سے اٹھ کر ملاں کی دوکان پہ آ بیٹھا تھا۔ ملاں کے اس فقرے سے وہ گرما گیا۔ ’’میاں یو تیرا خدا بڑا زہری ہے‘ جو اس کے اتیان کے اڑنگے میں آ گیا اس کا کباڑا ہوگیا۔‘‘

ملاں کو ٹوٹ کر غصہ تو شاید ہی کبھی زندگی میں آیا ہو‘ مگر اس کے لہجے میں ہلکی سی برہمی ضرور پیدا ہوگئی‘ کہنے لگا ’’بھیا خدا تو وے میرا بھی ہے اور تیرا بھی۔‘‘

شبراتی کا بغاوت کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جواب میں وہ کیا کہتا۔ اس کا سر جھک گیا اور اس کی ٹھوڑی کھسک کر اس کے گھٹنوں پر آن ٹکی۔ ملاں اب شبراتی سے قطعاً بے نیاز ہوکر فضا میں گھورنے لگا تھا۔ بدھیا کنجڑی‘ ہیرا‘ شبراتی‘ ملاں چاروں کے چاروں چند لمحوں

کے لئے بالکل گم سم ہوگئے۔ ان کے چہروں پہ کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی جو زندگی کی بے ثباتی اور کسی بڑی طاقت کے وجود کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔

آخر بدھیا کنجڑی چونکی ’’لا میرے بیرا دھنیا باندھ دے‘ میں چلی۔‘‘

ملاں نے ہڑبڑا کر ترازو اٹھائی اور دھنیا تول کر کاغذ میں باندھنے لگا۔ اب ہیرا بھی ہوش میں آگیا تھا۔ اس نے تقاضا کیا؟ ’’میاں مو کو بھی گلال باندھ دے۔‘‘

’’کتنے کا دوں؟‘‘

’’اکنی کا۔‘‘

’’لالہ اکنی کے گلال میں کیا ہینگ لگے گی۔ تہوار روز روز تھوڑا ہی آوے ہے۔‘‘

پہاڑن نکٹی اب بن ٹھن کے اپنے چھجے پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ کسی جلے تن نے پچھلے برس اس کی بے مروتی سے بھن کر دن دہاڑے دانتوں سے اس کی ناک کاٹ لی تھی۔ یوں اس کے سیاہ چہرے کی پھبن تو ضرور بگڑ گئی تھی مگر اس سے نہ تو اس کی قہر بھری گات کا جادو زائل ہوا تھا نہ اس کے ٹھسے میں فرق پڑا تھا۔ شبراتی نے اسے دیکھ کر زور سے انگڑائی لی اور اونچی لے میں گانے لگا۔

یارب نگاہ ناز پہ لیسنس کیوں نہیں؟

نبو کو یہ فائدہ تھا کہ خاں صاحبنی کی دیوار سے اس کی دیوار ملی ہوئی تھی بلکہ اس مشترک دیوار میں باہمی سمجھوتے سے ایک الٹی سیدھی کھڑکی بھی پھوڑ لی گئی تھی۔ آج کھڑکی نبو کے بہت کام آئی۔ آنسوؤں کا غلبہ جب بھی کم ہوا اور طبیعت رونے سے جب بھی ذرا اچاٹ ہوئی نبو اس کھڑکی سے نکل اپنے گھر پہنچ گئی۔

حلیمہ بوا نے تو اُلٹتے وقت اپنے ننھے نواسے کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ اب اس نے بھوک بھوک کا غل مچانا شروع کیا۔ جنازہ اٹھنے کے بعد وہ بھی اس کھڑکی سے نکل نبو کے گھر جا پہنچیں۔ ان کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ نبو کے گھر رات کا کوئی ٹکڑا نوالہ‘ بچا ہو تو نواسے کو کھلا کر اس کا حلق بند کردیں۔ وہاں وہ نبو سے باتوں میں لگ گئیں حلیمہ بوا کی آنکھوں میں ہاشم خان کی تصویر بار بار پھر جاتی تھی۔ خانصاحبنی کی بدنصیبی کا خیال بھی انہیں رہ رہ کر آرہا تھا۔ نبو پر بھی تقریباً یہی عالم گزر رہا تھا۔ چنانچہ جب حلیمہ بوا نے کہا کہ ’’ڈوبی خانصاحبنی تو جیتے جی مر

گئی'' تو نبو کی آواز میں بھی درد پیدا ہو گیا۔ بولی ''بدنصیب کی کوکھ اجڑ گئی' دو پوت تھے' دونوں ختم ہو گئے انگن میں جھاڑو دل گئی۔''

حلیمہ بوا کچھ دیر چپ رہیں' پھر کھوئے کھوئے انداز میں بولیں ''بعضوں کی قسمت ہی ایسی ہووے۔ خانصاحبنی کمبخت کو عہدے راس نہیں آتے۔ یاد نہیں ہے جب خانصاحب کو مجسٹریٹی ملی تھی تو کیسے کھٹیا پہ پڑے تھے۔''

''ہاں آج حاکم ہوتے۔ مرض کی بھینٹ چڑھ گیا عہدہ۔''

حلیمہ بوا کو خانصاحبنی کے بڑے بیٹے کا واقعہ یاد آ گیا۔ ''اس کا بڑا پوت بھی ایسے ہی جوانی کی بھری بہار میں گیا۔ اے بی بی یہ سمجھو کہ چاند کی پہلی کو تحصیلداری کا خط آیا اور ستائیسویں کو غریب کا تار آ گیا۔ وہ بھی آناً فاناً گیا خانصاحبنی کے گھر ساری موتیں ایسے ہی ہوئیں۔''

نبو کسی اور عالم میں کھو گئی تھی اس کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں ان میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ چند لمحے بالکل چپ رہی پھر ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''ہا...... پالیں پوسیں' چھاتی پہ سلا سلا کے بڑا کریں' اور پھر قبر میں سلائی آئیں' غضب ہے۔'' نبو پھر اسی عالم میں کھو گئی۔ حلیمہ بوا بھی کچھ متاثر ہوئیں اب وہ بھی چپ تھیں۔ حلیمہ بوا کو پھر کچھ یاد آیا۔ بولیں۔ ''کمبخت ہاتھوں میں دل رکھتی تھی پوت کا۔ اس عید پہ اس کے لئے وہ بھاری اچکن بنوائی کہ کیا کوئی بیاہ میں بنوائے گا۔''

نبو اسی کھوئے کھوئے انداز میں پھر بولی ''زرق برق پوشاکیں سب رکھی رہ جاویں ہیں چاند کے سے ٹکڑوں پہ دم کے دم سینکڑوں من مٹی پڑ جاوے ہے۔''

نبو چپ ہو گئی تھی۔ حلیمہ بوا گم متھان بنی بیٹھی تھیں۔

نبو ایک ساتھ پھر چونکی اور حلیمہ بوا سے مخاطب ہوئی ''حلیمہ بوا! یہ خدا کا کیا انصاف ہے' جسے اولاد دے گا دیئے چلا جاوے گا' جس سے چھینے گا وس کا گھر اوجڑ کر دے گا۔''

حلیمہ بوا بولیں ''اری میا شکایت کا ہے کی۔ اس کی چیز تھی اس نے لے لی۔''

نبو نے اک ذرا تلخی سے جواب دیا۔ ''اجی اولاد نہ ہو تو صبر ہے کہ بھئی تقدیر میں اولاد نہ تھی' نہ ہوئی' مگر کلیجے کے ٹکڑوں کو یوں مٹی میں ملانے کے لئے کہاں سے جگر آوے۔''

حلیمہ بوا کو کوئی جواب نہ بن آیا تو وہ خاموش ہو گئیں لیکن پھر جلد ہی ان کی سمجھ میں بات آ گئی' بولیں ''اجی سب اپنے اپنے اعمال ہووے ہیں......'' انہوں نے اِک ذرا تامل کیا اور پھر کہنے لگیں ''بی بی ہم نے تو کسی لڑنے والی کو پھلتے نہ دیکھا کمبخت دانتا کل کل کوئی اچھی بات تھوڑائی ہے۔ کلثوم سے خانصاحبنی کی تھوڑی لڑائی ہوئی تھی؟''

نبو کے لہجے کی کیفیت پھر بدلی۔ سنجیدہ سا منہ بنا کر کہنے لگی کہ ''بھئی ہمیں کیا ضرورت ہے کسی دوسرے کی بات کہہ کے برے بنیں' مگر کمبخت زباں نہیں مانتی۔ سچی بات کہنی ہی پڑے ہے۔ کلثوم بات بات پہ اس کے بیٹے کو یاد کرتی تھی آخر بیٹا بدنصیب ختم ہو گیا۔''

حلیمہ بوا بھی کچھ کہنا چاہتی تھیں' لیکن ان کے لاڈلے نواسے نے پھر وہی رٹ لگانی شروع کر دی کہ ''بوا جی بھوک لگی ہے'' حلیمہ بوا نے اسے بہت بہلایا پھسلایا' مگر وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ حلیمہ بوا کو خود بھی اس کی بھوک کا احساس تھا۔ نبو سے کہنے لگیں کہ ''میرا بچہ آج بھوک سے ہلکان ہو گیا۔''

نبو کو بھی دبی دبی شکایت پیدا ہوئی ''اجی ابھی تو میت گئی ہے' کب لوگ واپس آئیں اور کب روٹی ملے۔''

حلیمہ بوا کو یکا یک ایک سوال یاد آیا ''اری روٹی کس کی طرف سے ہے؟''

''صوبیدارنی دے رہی ہیں۔''

''پھر تو اچھی روٹی دے گی۔''

نبو تنک کر بولی۔ ''اجی ہاں آں اچھی روٹی دے گی' قبولی پک رہی ہے۔''

''قبولی؟'' حلیمہ بوا کو بڑا تعجب ہوا۔ ''ڈوبا یہ الغاروں پیسہ جو ہے وہ کیا چھاتی پہ دھر کے قبر میں لے جاوے گی۔''

نبو کہنے لگیں ''حلیمہ بوا! یہ تو سب دل کی بات ہووے ہے' ہمارے باپ کی کیا حیثیت تھی مگر تمہیں تو یاد ہو گا ہماری ساس کے مرنے پہ گوشت روٹی دی تھی۔''

حلیمہ بوا تائیدی لہجے میں بولیں۔ ''ارے بھئی برادری کا تو لحاظ کرنا ہی پڑے ہے۔ اور قبولی؟ قبولی تو بڈھوں ٹھڈوں کے مرنے میں دی جاوے ہے۔''

قبر تیار ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ علی ریاض' تجمل' باقر بھائی اور چھنوں میاں

قبرستان سے نکل کر کربلا کی طرف ہو لیے۔ یہ کربلا ایسی لمبی چوڑی عمارت تو نہیں تھی بس ایک بڑے رقبے میں پکی چار دیواری کھنچی ہوئی تھی۔ شاید دانستہ یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ اس میں درخت نہیں ہونے چاہئیں۔ پھر بھی ایک کونے میں نیم کے دو گھنے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ کربلا کے اندر نہ سہی' کربلا کے باہر ضرور جا بجا درخت نظر آتے تھے۔ اس کے عقب میں آموں کا ایک گھنا باغ تھا۔ بائیں سمت صرف بیریاں ہی نہیں بلکہ اس سے پرے املی کے بلند و بالا درخت بھی نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں کربلا لق و دق صحرا کا تاثر بھلا کیا پیش کرتی' مگر اس کی فضا ایک گہری اداسی کا رنگ لیے ہوئے ضرور تھی' یہ چہار دیواری تو پست ہی تھی لیکن اس کے پھاٹک کا آہنی کٹہرا خاصا بلند تھا اور اس سے ایک ایسا وقار ٹپکتا تھا جو اس قسم کی عمارتوں کے دروازوں سے مخصوص ہے۔ مگر یہ آہنی کٹہرہ عمارت کی سب سے بلند چیز نہیں تھی اس دروازے میں دو مینار بھی تو شامل تھے جو آہنی کٹہرے سے کہیں بلند تھے یہ الگ بات ہے کہ اس کھلی فضا میں وہ دور سے پست ہی نظر آتے تھے اس کھلی فضا میں ایک وسیع چہار دیواری کے ساتھ ان دو میناروں کو دیکھ کر اس قسم کی کیفیت گزرتی تھی جسے بعض لوگ کوئی صحیح لفظ موجود نہ ہونے کی وجہ سے احساس تنہائی کہنے لگتے ہیں۔

آہنی دروازے کے عین سامنے ایک پکی قبر تھی جو زمین کی سطح سے بالکل ہموار تھی۔

باقر بھائی کو آج ہی نہیں اس سے پہلے بھی اکثر مرتبہ اس قبر پہ رشک ہوا تھا کہ ہر سال دلدل کی ٹاپیں اور ماتمیوں کے قدم دونوں اسے مس کرتے ہیں۔ یہ تو خیر سب جانتے تھے کہ یہ قبر مولانا حیدر امام کی تھی اور ان کے زہد کا احترام کرتے ہوئے انہیں مناسب مقام پر دفن کیا گیا تھا مگر علی ریاض اس شعر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس قبر پہ نقش تھا۔ پہلا مصرعہ تو صاف تھا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ!

لیکن دوسرے مصرعہ کے آخری لفظ بالکل مٹ گئے تھے۔ ہمیں سو گئے داستاں...... علی ریاض نے بہت بہت سر مارا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر باقر بھائی نے اس معمے کو حل کیا کچھ تو انہیں مٹے ہوئے لفظ پڑھنے کی اٹکل تھی پھر یوں بھی انہوں نے مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا وقت شاعری کے مطالعے پر بھی صرف کیا تھا آخر بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے

دوسرا مصرعہ پڑھا۔

ہمیں سو گئے داستاں سنتے سنتے

علی ریاض نے ہی نہیں تجمل اور چھنوں میاں نے بھی شعر کی داد دی۔ علی ریاض نے بڑے اہتمام سے اپنے لہجے میں افسردگی کا رنگ پیدا کیا اور شعر پڑھنے لگا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں سنتے سنتے

''واہ'' چھنوں میاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''کس کا شعر ہے؟''

علی ریاض تھوڑا سا چکرایا پھر سوچتے ہوئے بولا ''انیس کا معلوم ہوتا ہے؟ کیوں باقر بھائی۔''

باقر بھائی نے جواب دیا ''بھئی شعر تو منہ سے بول رہا ہے کہ میں میر انیس کا ہوں۔''

''واہ واہ میر انیس بھی کیا کیا شعر کہہ گئے ہیں۔'' چھنوں میاں نے داد دی۔

''باقر بھائی!'' علی ریاض کا لہجہ ایکا ایکی بدلا ''سنتے ہیں کہ میر انیس شعر خود نہیں کہتے تھے۔''

چھنوں میاں کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ترخ کو بولے ''پھر کیا جنید خاں لکھ کے دے جاتے تھے۔''

علی ریاض نے جلدی سے اپنی بات کی تشریح کی ''بھئی ہم نے تو سنا ہے کہ محرم کے دنوں میں میر انیس جب سو کے اٹھتے تھے تو ان کے سرہانے امام حسینؑ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مرثیہ رکھا ہوتا تھا۔''

چھنوں میاں کے چہرے پہ سرخی جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے غائب ہو گئی ہاں اسی تیزی کے ساتھ ان کی آنکھوں میں حیرت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ''اچھا؟''

تجمل نے براہ راست باقر بھائی سے سوال کیا ''کیوں باقر بھائی' سچ ہے یہ؟''

باقر بھائی نہ معلوم کس قماش کے آدمی تھے' کسی بات کی نہ تو زور و شور سے تائید کرتے تھے اور نہ زور و شور سے تردید کرتے تھے ان کے جواب میں ہاں اور نہیں دونوں پہلو شامل ہوتے تھے کہنے لگے ''ہاں لکھنؤ کے بعض لوگ کہتے تو ہیں مگر تحقیق نہیں۔''

''بعض لوگ؟'' علی رضا کو تھوڑا سا جوش آیا ''لکھنؤ جا کے کسی سے پوچھ لو اور یہ واقعہ تو لکھنؤ کے بچے بچے کی زبان پہ ہے......''

تجمل نے بے صبرے پن سے پوچھا ''کیا واقعہ؟''

"یہی کہ ایک دفعہ میر انیس اور مرزا دبیر میں بحث ہوگئی کہ دیکھیں مولا کو کس کا مرثیہ پسند ہے۔ دونوں نے مرثیہ لکھا اور اپنا اپنا مرثیہ بڑے امام باڑے میں علموں کے پاس رکھ آئے۔ صبح کو جب جا کے دیکھیں ہیں تو میر انیس کا مرثیہ تو ویسا ہی رکھا ہے اور مرزا دبیر کے مرثیے پہ پنجے کا نشان۔"

"پنجے کا نشان؟" تجمل اور چھنوں میاں دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

علی ریاض نے بڑے اعتماد سے کہا "ہاں پنجے کا نشان" بس جناب میر انیس کا تو برا حال ہوا۔ سمجھے کہ مولا کی شان میں کوئی گستاخی ہوگئی۔ علموں کے ٹیکے سے آنکھیں ملتے تھے اور روتے تھے روتے روتے شام ہوگئی پھر رات ہوئی' ذرا آنکھ جھپکی ہوگی کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ میر انیس چونک پڑے" علی ریاض رکا اور چھنوں میاں اور تجمل دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے باری باری دیکھا تجمل اور چھنوں میاں دونوں حیرت سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے اور تو اور باقر بھائی کی بے نیازی میں بھی فرق آ چلا تھا علی ریاض پھر بولا "گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پاس آتی گئی' پاس آتی گئی۔ دیکھا کہ گھوڑا ہے۔ اس پہ ایک بزرگ سوار ہیں چہرے پہ سیاہ نقاب پڑی ہوئی' کمر میں تلوار۔ میر انیس کے برابر آئے اور ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے "میر انیس تو میری اولاد ہے۔ دبیر میرا عاشق ہے اس کا دل ٹوٹ جاتا۔" میر انیس کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ آنکھ کھلی تو نہ گھوڑا تھا نہ گھوڑ سوار۔ تڑکا ہو رہا تھا مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔"

علی ریاض کی داستان ختم ہو چکی تھی تجمل اور چھنوں میاں ایک ڈیڑھ منٹ تک علی ریاض کو تکتے رہے پھر ان کی نگاہیں باقر بھائی پہ جم گئیں۔ باقر بھائی نے ایک ذرا لاپرواہی سے کھنکار کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس داستان سے کچھ ایسے زیادہ متاثر نہیں ہیں پھر آپ ہی کہنے لگے "مگر اس روایت سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انیس خود مرثیہ لکھتے تھے۔"

"مگر صاب" باقر بھائی اب کسی کے اشارے کے بغیر چل رہے تھے۔ "انیس کی شاعری واقعی انسانی کلام نہیں ہے...... معجزہ ہے" باقر بھائی چند لمحوں کے لئے بالکل خاموش رہے اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے۔

"گودی ہے کبھی اماں کی کبھی قبر کا آغوش
گل پیرہن اکثر نظر آئے ہیں کفن پوش
سرگرم سخن ہے کبھی انساں کبھی خاموش
گہہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بہ سرِ دوش"

باقر بھائی اک ذرا رک کے ان کی آواز ڈوبنے لگی تھی "ہا" کیا شعر ہے۔

اِک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مِسن کو
شب کو تو چھپر کھٹ میں تابوت میں دن کو

باقر بھائی چپ ہو گئے اب وہ پھر بُت بن گئے تھے۔ علی ریاض' تجمل اور چھنوں میاں پہ بھی سکتہ چھا گیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ آس پاس کے نیم اور املی کے درختوں میں دھیما دھیما شور برپا تھا۔ ہوا بہت تیز تو نہیں تھی اسے موسم کا اثر کہیے کہ ہوا کا کوئی جھونکا دبے پاؤں بھی آتا تو زرد پتوں کو بہانہ مل جاتا اور ٹہنیوں سے بچھڑ کر فضا میں تیرنے لگتے۔ بہتی ہوئی ریت کے ریلے میں نیم کے بہت سے ننھے ننھے زرد پتے بھی آ گئے تھے اور قبر پہ بڑے قرینے سے بچھ گئے تھے۔

اس نیم بیدار نیم خوابیدہ فضا میں نیم کے درختوں سے لے کر کربلا کی دیواروں کی منڈیروں تک ہر چیز کچھ اُجڑی اُجڑی نظر آ رہی تھی اور علی ریاض' تجمل' چھنوں میاں گم متھان بنے بیٹھے تھے اور باقر بھائی پر مراقبے کی کیفیت طاری تھی۔

آخر چھنوں میاں نے اس سکوت کو توڑا۔ انہوں نے بڑے مرے ہوئے انداز میں انگڑائی لی "بھئی دھوپ میں چنچنی آ گئی' یاں سے اُٹھو۔"

چھنوں میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چھنوں میاں نے اس سلسلے میں مشورے یا اطلاع کی ضرورت نہیں سمجھی۔ شاید نادانستہ طور پر ان کے قدم بیریوں کی طرف اٹھ گئے تھے۔ یہ بیریاں اس سال اللہ دیئے نے لے رکھی تھیں۔ اس برگزیدہ قافلے کو بیریوں کی طرف آتے دیکھا تو بے تحاشا لپکا ہوا آیا قریب پہنچ کر اس نے چھوٹتے ہی سلام کیا "میاں سلام۔"

"سلام" صرف چھنوں میاں نے سلام کا جواب دینا ضروری سمجھا۔

بیریوں میں داخل ہوتے ہوتے چھنوں میاں کہنے لگے "صاب! موسم بدل ہی گیا۔ دھوپ میں اچھی خاصی تیزی آ گئی ہے۔"

"ہاں" تجمل بولا۔ "جاڑے تو اب گئے ہی سمجھو۔ میں ہولی کے انتظار میں ہوں۔ ہولی جلی اور میں نے باہر سونا شروع کیا۔"

"اگلے شکر کو جل جاوے گی جی۔ بس چھنوں میاں بیر بھی اگلے شکر تک کے ہیں۔ ہولی کے بعد ان میں گنڈار پڑ جاوے گی۔" پھر ذرا رک کر بولا "میاں بیر کھا لو۔"

چھنوں میاں بیزار ہو کر بولے۔ "میرے یار، دم تو لینے دے۔"

اللہ دیا چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی اور پیچھے تجمل کے برابر برابر ہو لیا۔

کچھ دیر وہ خاموش چلتا رہا، پھر آہستہ سے بولا "تجمل میاں کتنی دیر ہے دفن ہونے میں؟"

"زیادہ دیر نہیں۔"

اللہ دیا خاموش چلتا رہا، پھر ذرا ہچکچا کر بولا "تجمل میاں جو ہونی ہووے ہے وے ہو کے ہی رہووے ہے۔ میرا ماتھا وسی وخت ٹھنکا تھا میں نے ہاشم میاں کو منع بھی کیا پر انہوں نے میری سنی نہیں۔"

علی ریاض چپ چاپ پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ان فقروں پہ ان کے کان کھڑے ہوئے انہوں نے چال تیز کر دی اور پاس آ کر بولے "کیا بات تھی؟"

"اجی میں اس روز کے شکار کی بات کر رہا ہوں" اللہ دیئے کی آواز اب ذرا بلند ہو گئی تھی "چھنوں میاں تو ساتھ تھے پوچھ لو، میں نے منع کیا تھا یا نہیں، سالا نیل کنٹھ رستہ کاٹ گیا۔ میں نے کہیا کہ ہاشم میاں لوٹ چلو۔ پر انہوں نے مجھے ڈپٹ دیا۔ جب ہرنی اٹھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا" اللہ دیا چپ ہوا اور جب وہ پھر بولا تو اس کی آواز نے تقریباً سرگوشی کا رنگ اختیار کر لیا تھا "اجی وس کے ہرن کو پچھلے مہینے ہاشم میاں نے مارا تھا۔ میرا دل اندر سے یو کیوے کہ اللہ دیئے آج کچھ ہووے گا۔ میں نے کہیا کہ ہاشم میاں گولی مت چلاؤ پر جی وِنہوں نے مجھے پھر جھڑک دیا۔"

اللہ دیا چپ ہو گیا۔ بیریوں کے پتے خاموش تھے۔ ہوا شاید بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ صرف قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اللہ دیئے کی جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سب لوگ

چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اللہ دیئے نے حقہ بھی تازہ کر کے رکھ دیا تھا۔ چھنوں میاں نے دو گھونٹ خاموشی سے لیے پھر آپ ہی آپ کہنے لگے۔ "بھئی اب کچھ ہی کہہ لو مگر ہم تو بچپن سے شکار کھیلتے آ رہے ہیں ہم نے تو کبھی شگن وگن کی پرواہ کی نہیں۔"

علی ریاض بولے۔ "بھائی یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ صاحب بڑے بوڑھے لوگ بڑے دقیانوسی تھے توہم پرست تھے...... مگر صاحب ان کا کہا ہوا آج بھی پتھر کی لکیر ہے۔"

"یہ واقعہ ہے۔" تجمل نے ٹکڑا لگایا۔

علی ریاض کی بات جاندار تھی۔ چھنوں میاں کو مجبوراً باقر بھائی سے رجوع کرنا پڑا۔

"باقر بھائی آپ کا کیا خیال ہے؟"

باقر بھائی پھر اپنے اسی مہذب لہجہ میں بولے "اللہ بہتر جانتا ہے کیا بھید ہے...... ویسے ہم نے بہت سی رسمیں ہندوؤں سے لی ہیں۔ اسلام تو شگون وگون کا قائل ہے نہیں۔"

چھنوں میاں کی بات کی تائید ہوئی تھی، پھر بھی انہوں نے اس جواب پہ کچھ بے اطمینانی سی محسوس کی۔

علی ریاض چند لمحوں تک بالکل گم سم رہا پھر بڑبڑانے لگا "اس کے بھید وہی جانے عجب طلسمات ہے یہ دنیا۔"

باقر بھائی کی نیت جواب دینے کی نہیں تھی۔ بس یونہی بیٹھے بیٹھے وہ کہنے لگے "میاں ہم تو یہ جانتے ہیں کہ تقدیر میں جو لکھ گیا ہے وہ مٹ نہیں سکتا۔"

باقر بھائی پھر کسی دوسری دنیا میں جا پہنچے۔ علی ریاض، تجمل اور چھنوں میاں گم متھان بنے بیٹھے تھے۔ ہوا کا تنفس بہت دھیما ہو گیا تھا۔ مگر بیریوں کے پتوں میں ایک دبا دبا شور تھا کچھ ایسا شور کہ بچے چوری چھپے کچھ کتر کتر کھا رہے ہوں۔ اللہ دیئے نے جلدی سے گوپھیا اٹھائی اور اس میں اینٹ رکھ کر آگے چلا بیریوں کے بیچوں بیچ درختوں کے گھنے سائے میں پہنچ کر اس نے گوپیا گھمائی اور ساتھ میں حلق سے للکارنے کی آواز بھی نکالی۔ بیریوں کے پتوں میں یکایک ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور طوطوں کی ایک ڈار چیختی چلاتی تیزی سے پتوں کی تہ سے اٹھی اور فضا میں ایک الٹی سیدھی سبز دھاری بن کر پھیل گئی۔ گوپھیا نے دوہرا طلسم پیدا کیا اس کے ایک اشارے سے سبز طوطے آسمان کی طرف اٹھے اور سبز سرخ بیر زمین پہ گرے۔ اللہ

دیئے نے سرخ سرخ بیروں سے گود بھری اور اسے مہمانوں کے سامنے جا کر خالی کر دیا کہنے لگا
''میاں پونڈا بیر ہے پکے پکے بین کے لایا ہوں' ذرا چکھ کے دیکھو۔''

باقر بھائی نے کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا۔ ہاں علی ریاض نے ان کے کھٹ مٹھے ہونے کی تعریف کی۔ چھنوں میاں کا خیال تھا کہ اگر پسا ہوا نمک ہوتا تو لطف آ جاتا۔ تجمل بیر کھاتے کھاتے پوچھنے لگا۔ ''ابے اللہ دیئے بیریوں سے تو نے اچھا کما لیا ہوگا؟''

اللہ دیا بڑے افسردہ سے لہجے میں بولا۔ ''اجی تجمل میاں ان بیروں سے کیا ہینگ لگے گی۔ اب کے برس بڑا گھاٹا آیا ہے۔ آموں کی فصل سوکھی نکل گئی ساری رقم ڈوب گئی۔ سنگھاڑوں کی بیل لی تھی' وسے جونک لگ گئی تجمل میاں بس اپنی تو بدھیا بیٹھ گئی۔'' سنگھاڑوں کی بیل سے اللہ دیا کا ذہن کسی اور طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا رخ چھنوں میاں کی طرف ہو گیا
''اجی چھنوں میاں وے پوکھر تھی نہیں اپنی۔ وس پہ آج کل مرغابی بہت گر رئی ہے۔''

چھنوں میاں چونکے ''اچھا؟''

''ہاں میاں''

''پھر چلیں کسی دن۔''

اللہ دیا بولا ''چھنوں میاں اس سالے جانور کا بھروسہ نہیں ہے۔ بس چلنا ہے تو جلدی چلے چلو کسی دن پو پھٹنے سے پہلے تاروں کی چھاؤں میں چلو تڑکے تڑکے۔''

چھنوں میاں جواب دینے ہی والے تھے کہ علی ریاض بیچ میں بول اٹھا اس کی آنکھیں دور قبرستان کی طرف دیکھ رہی تھیں ''یار' لوگ تو واپس جا رہے ہیں حد ہو گئی' ہم یہیں بیٹھے رہ گئے۔''

چھنوں میاں' علی ریاض' تجمل باقر بھائی چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیریوں سے باہر نکلتے ہوئے اللہ دیئے نے پھر چھنوں میاں کو ٹوکا۔ ''تو چھنوں میاں کب چل رہے ہو؟''

چھنوں میاں دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بولے۔ ''کل؟ کل نہیں...... پرسوں تیجا ہے۔ ہاں اترسوں آ جائیو مگر دن چڑھنے سے پہلے پہلے واپس آنا ہے۔''

اللہ دیا گرما کر بولا ''دن چڑھے؟ کیا کہہ رہے ہو چھنوں میاں' اجی' فجر کی نماز مسجت میں آ کے پڑھیں گے۔''

☆......☆......☆

ٹھنڈی آگ

مختار صاحب نے اخبار کی سرخیوں پر تو نظر ڈال لی تھی۔ اب وہ اطمینان سے خبریں پڑھنے کی نیت باندھ رہے تھے کہ منی اندر سے بھاگی بھاگی آئی اور بڑی گرمجوشی سے اطلاع دی کہ ''آپ کو امی اندر بلا رہی ہیں۔''

منی کی گرمجوشی بس اس کی ننھی سی ذات ہی تک محدود تھی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب اسی طرح گم سم بیٹھے رہے۔ مختار صاحب نے آہستگی سے اخبار ان کی طرف بڑھا دیا اور انہوں نے اسی آہستگی سے اخبار اپنے سامنے چارپائی پر بچھایا۔ اتاری ہوئی عینک پھر چڑھائی اور اخبار پر جھک گئے۔ مختار صاحب اک ذرا بے دلی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مختار صاحب کے اندر جانے اور بلائے جانے کا یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ لیکن یہ واقعہ اس لحاظ سے ضرور اہم تھا کہ اس کے بعد ان کے اندر جانے اور بلائے جانے کا سلسلہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ رہی یہ بات کہ یہ سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا تو ایک یہی کیا مختار صاحب کی زندگی کے کسی بھی سلسلے کی ابتدا نہیں ملتی تھی۔ دراصل ان کی زندگی میں تیز قسم کا موڑ کبھی نہیں آیا تھا۔ رستے ضرور بدلے تھے مگر غیر محسوس طور پر۔ ان کی زندگی میں جو بھی تبدیلی آئی، پتہ اس وقت چلا جب وہ جینے کا ڈھرا بن چکی تھی۔ خود پوسٹ ماسٹر صاحب سے ان کے تعلقات کی نوعیت کچھ اسی طرح کی تھی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب برادری کے ایک فرد ضرور تھے لیکن مختار صاحب برادری کے کس شخص سے ملتے تھے جو ان سے ہی ملتے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کی ملنساری کو تو شاید ڈاکخانے نے چوس لیا تھا۔ جب تک ان کی پنشن نہیں ہوئی تھی ان کا طور یہ رہا کہ صبح نو بجے گھر سے نکلنا' سارے دن منی آرڈروں' رجسٹری کے لفافوں اور پارسلوں میں غرق رہنا اور شام کو خاموش سر نیوڑھائے گھر واپس آنا۔ شروع میں زمانے نے اتنی مہلت نہ

دی کہ شادی کر لیتے۔ جب ذرا فراغت ہوئی تو دل مر چکا تھا۔ ان کی زندگی میں اتنی تبدیلی بھی نہ آئی کہ ملازمت کے سلسلے میں کہیں تبادلہ ہی ہو جاتا۔ اپنے قصبے کے چھوٹے سے ڈاکخانے میں تعینات ہوئے اور اسی ڈاکخانے سے پنشن لے کر نکلے۔ تڑکے اٹھنا' نماز پڑھنا اور باہر بیٹھک کے چبوترے پہ مونڈھے پر آ بیٹھنا۔ اخبار والا اردو کا اخبار ڈال جاتا' کیس سے عینک نکالتے اور بڑی سرخی سے لے کر پرنٹ لائن تک پورا اخبار پڑھتے اور حقہ پیتے رہتے۔

برابر میں ننوا حلوائی کی دکان تھی۔ دراصل ننوا حلوائی کی دکان ہی کی معرفت مختار صاحب کی ان تک رسائی ہوئی تھی۔ ورنہ پہلے تو محض دور کی علیک سلیک تھی۔ مختار صاحب نے ناشتہ ہمیشہ جلیبیوں کا کیا۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھتے اور سیدھے اپنے کھیتوں کا رخ کرتے۔ واپسی میں ننوا حلوائی کی دکان پر پڑاؤ کرتے' دونا بھر جلیبیاں خرید' کھڑے کھڑے کھاتے اور پھر اکیلے گھر میں آ پڑتے۔ ننوا کی دکان پر صبح کو جلیبیاں خریدنے والوں کا اچھا خاصا جمگھٹا ہو جاتا تھا' اس لیے اکثر انہیں خاصی دیر کھڑا بھی رہنا پڑتا تھا۔ صبح ہی صبح اخبار دیکھ کر کس کا جی نہیں للچاتا۔ ایک آدھ دفعہ ایسا ہوا کہ مختار صاحب دکان سے ہٹ کر چبوترے کے پاس کھڑے ہو گئے اور دور سے خبروں کی سرخیوں پر اڑتی سی نظریں ڈال لیں۔ پھر پوسٹ ماسٹر صاحب کو اس کا احساس ہوا تو ایک دو مرتبہ انہوں نے بیچ کا صفحہ نکال کر انہیں دے دیا۔ رفتہ رفتہ مختار صاحب نے یہ شیوہ اختیار کیا کہ جلیبیاں بننے میں دیر ہوتی تو وہ آہستہ سے چبوترے پر پوسٹ ماسٹر صاحب کے مونڈھے کے برابر آ کھڑے ہوتے اور حقہ پینے لگتے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب پہلے بیچ کا اور پھر پہلا اور آخری صفحہ انہیں تھما دیتے اور وہ کھڑے کھڑے پڑھتے رہتے۔ ننوا کی آواز پہ مختار صاحب خاموشی سے اخبار چارپائی پر رکھتے اور سلام و دعا کیے بغیر وہاں سے سرک جاتے۔ آتے وقت ضرور علیک سلیک ہوتی تھی۔ باقی رہی گفتگو تو اگر اخباروں کے صفحوں کے تبادلے کو گفتگو کہا جا سکتا ہے تو ان میں گفتگو ضرور ہوتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ مختار صاحب خود ہی بے دھیانی میں مونڈھے پہ بیٹھ گئے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے کبھی ان سے بیٹھ جانے کی درخواست نہیں کی تھی' مگر ان کے بیٹھ جانے پر کسی بے کلی کا اظہار بھی نہیں کیا اور نہ کسی قسم کی خوشی ظاہر کی۔ مختار صاحب مونڈھے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کے خود ہی عادی بن گئے۔ رفتہ رفتہ یہ خاموش تعلق خود اپنے زور پر زیادہ گہرا اور زیادہ پختہ ہوتا چلا گیا۔ اس تعلق

کے زیادہ گہرے اور پختہ ہونے کا اظہار دو طریقوں سے ہوا۔ ایک تو اس طرح کہ آتے ہی جو رسمی علیک سلیک ہوتی تھی وہ ختم ہو گئی۔ دوسرے اس طرح کہ جلیبیوں کا دونا اب چبوترے پہ ہی آ جاتا تھا۔ مختار صاحب آتے ہی دکان پہ ایک نظر ڈالتے۔ اس وقت بالعموم چولھے پر گھی کرکڑا رہا ہوتا تھا۔ ننوا کو وہ ایک نظر اس انداز سے دیکھتے گویا کہہ رہے ہوں کہ بھئی میں آ گیا ہوں اور ننوا کی نظر اسی لہجے میں اس نظر کا جواب دیتی۔ مختار صاحب خاموشی سے چبوترے پر پہنچتے اور مونڈھے پر ڈٹ جاتے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کے چہرے پر بشاشت کی ایک خفیف سی لہر دوڑ جاتی اور پھر وہ اخبار کا پہلا صفحہ ان کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اخبار پڑھنے کے دوران ہی میں دکان سے ننوا کی آواز آتی۔ "مختار صاحب اپنی جلیبیاں لے لو۔" اور مختار صاحب مونڈھے سے اٹھ کر دونا لے آتے۔ مونڈھے پہ پھر آ بیٹھتے۔ دونے سے جلیبیاں کھاتے اور دونا چبوترے سے باہر پھینک کر جہاں بالعموم ایک بدرنگ کالا کتا اس کا منتظر ہوتا وہ پھر اخبار کا صفحہ اٹھا لیتے۔ پھر اتنے میں اندر سے منی نکل کر آتی اور کہتی۔ "ماموں جان امی جان کہہ رہی ہیں ناشتہ کر لیجئے۔" پوسٹ ماسٹر صاحب خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوتے' اندر جا کر ناشتہ کرتے اور پھر آ بیٹھتے۔

اخبار پڑھتے پڑھتے بالعموم دونوں کی آنکھیں بیک وقت تھکتیں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب عینک اتار کے سامنے کھڑی چارپائی پہ رکھ دیتے اور آسمان کو تکنے لگتے۔ تانبا آسمان پر دھوپ سے چمکتے ہوئے سفید سفید بادل جو آہستہ آہستہ تیرتے رہتے۔ اتنی آہستہ گویا اب رکے اور اب تھمے اور پھر ہولے ہولے ان کی شکلیں بدلتیں۔ افریقہ کا جنوبی حصہ' خلیج بنگال' لومڑی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بڑی آہستگی سے گویا اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں۔ "بڑی گھمس ہے۔ مینہ پڑے گا۔"

اور مختار صاحب ہولے سے گویا اپنے آپ کو جواب دے رہے ہوں بول اٹھتے۔ "اس وقت بارش ہو گئی تو فصل بڑی اچھی ہو جائے گی۔"

پھر خاموشی چھا جاتی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب اسی طرح آسمان کو تکتے رہتے اور مختار صاحب اونگھنے لگتے۔ آنکھیں بند ہونے لگتیں' سر جھکنے لگتا اور پھر اچانک چونک پڑتے۔ ان کا ہاتھ چہرے کی طرف اٹھ جاتا "اس دفعہ اتنی مکھیاں نہ جانے کہاں سے آ گئی ہیں۔"

اور جواب میں پوسٹ ماسٹر صاحب بڑبڑانے لگتے۔ ''دن کو مکھیاں' رات کو مچھر۔ ایک پل کو نیند نہیں آتی...... جان ضیق میں ہے۔''

دھوپ رینگتی رینگتی چارپائی کی پائنتی سے آلگتی۔ مختار صاحب بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ''طپش ہوگئی۔''

پوسٹ ماسٹر صاحب مونڈھے اٹھا کر دالان میں ڈالتے' پھر چارپائی اور حقہ اٹھا کر دالان کے اندر والی کوٹھڑی میں لے جاتے' پھر اندر جاتے۔ بیوہ بہن کھانا سامنے لا کے رکھ دیتی۔ خاموشی سے کھانا کھاتے اور کوٹھڑی میں جا کے سو رہتے۔

مختار صاحب خالی ہاتھ ہی آتے تھے اور خالی ہاتھ ہی جاتے تھے۔ مگر بھٹوں کے زمانے میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ چلتے چلتے کھیت سے تین چار بھٹے توڑ لاتے اور جب منی باہر آتی تو اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ پھر جاڑوں میں ایک دو مرتبہ انہوں نے رس کے گھڑے بھی بھجوائے تھے۔ شاید رس کی کھیر کی تقریب ہی سے انہیں اندر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ مختار صاحب ایسے بزرگ نہ سہی مگر بزرگوں والی سنجیدگی چہرے پہ آچلی تھی۔ کنپٹی کے آس پاس کے بال خاصی تعداد میں سفید ہو گئے تھے۔ سر کے آگے کے بال اڑ جانے کی وجہ سے پیشانی خاصی کشادہ ہوگئی تھی اور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ بوڑھے تو نہیں ہوئے تھے مگر بڑھاپے کے دروازے پر ضرور کھڑے تھے۔ رقیہ جس عمر میں تھی اسے بھی شاید جوانی اور بڑھاپے کا دوراہا ہی کہنا چاہیے۔ اس عمر میں برادری کے مردوں سے بالعموم پردہ اٹھ جایا کرتا ہے۔ پھر بھی مختار صاحب جب بھی اندر آئے رقیہ اک ذرا گھونگھٹ نکال لیتی تھی۔ اس وقت وہ مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ مختار صاحب کو آتے دیکھ کر اس نے ہاتھ روکا اور آہستہ سے گھونگھٹ نکال لیا۔

''اجی آپ کو مبارک ہو۔ اکیلے ہی اکیلے بیٹی کا بیاہ کر آئے۔ ہمیں جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔''

رقیہ نے شادی کا ذکر بڑی گرمجوشی سے چھیڑا تھا۔ مگر مختار صاحب نے بڑی مردہ دلی سے جواب دیا۔ ''اجی بیاہ ویاہ کاہے کا ہے۔ چار بول نکاح کے پڑھے گئے۔ بس ٹھیک ہے۔''

''اے واہ! یہ بچنے کا اچھا بہانہ ہے۔'' رقیہ نے اسی جوش سے بات کی۔ ''نا مختار

صاحب ہم نہ مانیں گے۔ بیاہ میں نہ بلایا تو اب منہ میٹھا بھی نہ کرو گے۔'' اور منہ میٹھا کرنے کی بات کرتے ہوئے انہوں نے یکایک سوال کیا۔ ''اجی جہیز میں کیا کیا دیا؟''

''جہیز؟ کیا تھا جہیز وہیز...... کونسا چھکڑا بھر کے سونا دے دیا؟''

''اے ہے یہ کیا بات ہوئی۔ چھکڑا بھر کے سونا تو راجہ مہاراجہ بھی نہیں دیتے۔ اللہ رکھے باپ صاحب جاداد ہے۔ بھیا بھی کما رہا ہے۔ جہیز کیا ایسا ویسا ہوگا...... اور ہاں مہر کتنے کا بندھا؟'' رقیہ نے جہیز کی بات کرتے کرتے ایک اور سوال کر ڈالا۔ ''مہر؟'' مختار صاحب سٹ پٹائے اور پھر اسی بے اعتنائی سے بولے ''بی بی مجھے تو مہر وہر کا پتہ نہیں۔''

''اے لو کیسے بیٹی کے باپ ہیں۔ آپ کو مہر کا پتہ نہیں ہے؟'' رقیہ نے تعجب کا اظہار ضرور کیا لیکن اسے کوئی خاص تعجب ہوا نہیں تھا۔ بیوی بچوں سے مختار صاحب کی بے اعتنائی کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی۔ یہ بے اعتنائی کوئی نئی نہ تھی۔ اس کی عمر اتنی ہی تھی جتنی ان کی شادی کی۔ ماں باپ نے شادی کر دی۔ انہوں نے شادی کر لی۔ شادی کے خلاف نہ تو انہوں نے احتجاج کیا اور نہ اس کے بارے میں گرمجوشی دکھائی۔ سہرا بندھ گیا' دلہن گھر میں آگئی۔ بے اعتنائی برقرار رہی۔ شادی کے شروع کے زمانے میں بیوی بے شک گھر ہی میں رہی تھی مگر جب بچوں نے ہوش سنبھالا تو انہوں نے اپنے آپ کو نانا کے گھر میں پایا۔ البتہ بڑے لڑکے زاہد کے ذہن میں باپ کے گھر کا ایک دھندلا سا نقشہ ضرور موجود تھا۔ مختار صاحب کو نہ تو بیوی سے کوئی خاص رغبت تھی نہ اولاد کا چاؤ پیدا ہوا۔ ہر مہینے باقاعدگی سے خرچ ضرور بھیج دیتے تھے مگر خود کبھی مہینوں بھی جا کے نہیں پھٹکتے تھے۔ تیج تیوہار کے موقعہ پر جاتے بھی تو بطور مہمان' اپنی اولاد کی تقریبوں میں ہمیشہ اس انداز سے شرکت کی جیسے رشتہ داروں کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور اولاد بلکہ خود بیوی بھی کچھ یہی سمجھتی کہ کوئی رشتہ دار آیا ہوا ہے۔ دو چار دن ٹکتے اور بغیر کسی وجہ کے چل کھڑے ہوتے۔ بیوی سے زور شور سے لڑائی کبھی نہیں ہوئی۔ باہمی کشیدگی خفگی کی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھی اور اب وہ بے اعتنائی کی شکل میں مستقل ہو کر رہ گئی تھی۔ بیوی باپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتی تھی اور جوان اولاد کے ساتھ خوش تھی۔ مختار صاحب بیوی سے کوسوں دور اپنے شہر میں اکیلے مکان میں مطمئن تھے اور کسی دوسرے وجود کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ گاڑی کے دونوں پہیے اپنی اپنی راہ چل رہے تھے اور بغیر کسی

حادثے کے خدشے کے۔ جب کوئی کاج ہوتا تو مختارنی زاہد سے کہہ دیتیں کہ ''بیٹا اپنے باپ کو بھی خط لکھ دے اور ہاں یہ بھی لکھ دیجو کہ اب کے روپے زیادہ بھیجیں۔'' بیٹی کی شادی کے موقعہ پر بھی یہی ہوا۔ زاہد نے شادی کی تاریخوں کی اطلاع دے دی تھی۔ مختار صاحب شادی سے دو دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ باہر والوں نے بیاہ کے گھر میں سب کو چلتے پھرتے لپکتے جھپکتے دیکھا اور نہیں دیکھا تو مختار صاحب کو۔ بارات کا استقبال کرنے والوں کی قیادت دلہن کے نانا کر رہے تھے۔ دولہا کے باپ نے کئی مرتبہ مختارنی سے تقاضا بھی کیا کہ ''اجی ہمارے سمدھی کہاں ہیں۔'' مختارنی نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ ''یہیں کہیں ہوں گے۔'' مگر ایک مرتبہ جل کر کہہ ہی دیا کہ ''اجی وہ تو مانس گند ہیں۔ کہیں کونے کھدڑے میں الگ پڑے ہوں گے'' مگر دراصل وہ اس وقت کسی کونے کھدڑے میں نہیں تھے۔ جس کسی باراتی کا باورچی خانہ میں گذر ہوا اس نے ایک سنجیدہ صورت' ادھیڑ عمر کے شخص کو مونڈھے پہ گم متھان' حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے دیکھا۔ یہ انہیں نکاح کے وقت پتہ چلا کہ یہ بیٹی کے باپ ہیں۔ نکاح کے بعد مختار صاحب پھر غائب ہو گئے اور رخصت کے وقت تک کسی کو نظر نہیں آئے۔ مختصر یہ کہ مختار صاحب نے شادی خود نہیں دیکھی' رقیہ کو کیا بتاتے اور کیا حال سناتے۔ اس کا ذوق جستجو تشنہ ہی رہا۔ اس نے ہار کر شادی کے متعلق پوچھ گچھ ہی ختم کر دی اور دوسری بات شروع کر دی۔ ''مختار صاحب اب بیٹی کا بوجھ اتر گیا ہے۔ اب بیٹے کا بھی بیاہ کر ڈالئے۔ بہت کمائی کھائی آپ نے اس کی'' دراصل یہ ذکر رقیہ کو شادی کا تمام احوال سننے کے بعد چھیڑنا چاہیے تھا' مگر مختار صاحب کی طرف سے مایوس ہو کر اسے چند باتوں کے بعد ہی یہ ذکر چھیڑ دینا پڑا۔ مختار صاحب نے اس پر بھی ایسی گرمی کا اظہار نہیں کیا۔ قدرے بیزاری سے بولے۔

''اجی ہم کون بیاہ کرنے والے' خود بیاہ کریں گے۔''

رقیہ نے بات کو دوسرا ہی رنگ دے دیا کہنے لگی۔ ''ہاں......اس اصلی بوجھ تو بیٹی کا ہوتا ہے۔ بیٹوں کا کیا ہے۔ لڑکا لائق ہوا چھی لڑکی ہر وقت مل جاتی ہے۔''

رقیہ نے مختار صاحب کے اس افسردگی آمیز بیزار کن انداز کو موافق مطلب نہیں پایا تھا لیکن بعد میں وہ اس سے ایسی مانوس ہوئی کہ مختار صاحب جب بھی اندر آتے وہ ادبدا کے ان کے بیوی بچوں کا ذکر چھیڑتی۔ کبھی کہنے لگتی۔ ''اجی اب آپ بیٹی کو کب بلوا رہے ہیں۔ سسرال

میں اس کا جی نہ گھبراتا ہوگا۔ پہلی دفعہ چھٹی ہے۔''

مختار صاحب بڑی سرد مہری کے ساتھ آہستہ سے کہتے۔ ''آجائے گی'' اور پھر چپ ہو جاتے۔

پھر رقیہ زاہد کی شادی کا ذکر چھیڑ دیتی۔ ''اجی' ہم نے سنا ہے کہ آپ کے زاہد کی منگنی ہو رہی ہے۔''

''ہو رہی ہوگی۔ اس کی ماں جانے۔'' مختار صاحب اسی سرد مہری کے ساتھ آہستہ سے کہتے اور پھر اونگھنے لگتے۔

رقیہ فوراً بولتی۔ ''اجی یہ کیا بات کہی آپ نے کہ اس کی ماں جانے۔ آخر آپ بھی تو باپ ہیں۔ باپ کیوں نہ جانے۔''

مختار صاحب ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہتے۔ ''اجی کون باپ واپ' نہ ہم کسی کے باپ نہ ہماری کوئی اولاد۔''

''اے لو یہ اچھی رہی۔'' اور رقیہ کو ایک عجیب سی نامعلوم قسم کی آسودگی محسوس ہوتی۔

مختار صاحب کا اندر کا آنا جانا روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ لیکن اتنی آہستگی سے کہ اس کا احساس نہ تو پوسٹ ماسٹر صاحب کو ہوا نہ رقیہ کو اور نہ خود انہیں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے وہ آہستگی سے حقے کی نے ہونٹوں میں دبا لیتے۔ نگاہیں اخبار سے ہٹ کر سامنے والی دیوار پر جم جاتیں' آہستہ آہستہ حقے کا گھونٹ لیتے' دیوار پہ نظریں جمی رہتیں۔ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے۔ اچانک منی کسی طرف سے کھیلتی ہوئی آ نکلتی اور وہ خیالات کی رو کو ایک طرف جھٹک کر سوال کرتے۔ ''بیٹی تیری ماں کیا کر رہی ہے۔'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر اسی طرح ہاتھ میں اخبار لیے ہوئے اٹھتے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلے جاتے' رقیہ کا وہ پہلے والا حجاب ختم ہو چکا تھا۔ گھونگھٹ چھوٹا ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکا تھا۔ ہاں سر کھلا ہوتا (اور اب اکثر کھلا ہوتا تھا) تو مختار صاحب کو دیکھ کر ڈھک لیا جاتا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ احتیاط سینے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ رقیہ کا جسم ڈھل گیا تھا لیکن ڈھلتا' بدن بھی اپنا الگ حسن رکھتا ہے۔ روٹی پکاتے ہوئے جب اس کے نیم برہنہ بازو گردش کرتے تھے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کی گولائی زائل ہو چکی ہے' مگر ان ڈھلکتے ہوئے گورے بازوؤں سے ایک عجب حلاوت کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ مختار

صاحب کی نگاہیں کبھی کبھی بے دھیانی سے ان پر جا پڑتی تھیں۔ مگر فوراً ہی جھک جاتی تھیں۔ مختار صاحب نے اس حد تک احتیاط ہمیشہ برتی کہ چوکھٹ میں قدم رکھنے سے پہلے کھنکار دیتے تھے۔ رقیہ چولھے پر روٹی پکانے اس انداز سے بیٹھتی تھی کہ دوپٹہ سامنے والی کھونٹی پر ٹانگا۔ آستینیں کہنی سے اوپر بازوؤں تک چڑھائیں اور پھر آٹے کے پیڑے بنانے شروع کر دیئے۔ چولھے کے سامنے ذرا دیر بیٹھنے سے چہرہ تمتمانے لگتا۔ کوئی لٹ بکھر کر رخسار پہ آ پڑتی اور پسینے سے چپک جاتی۔ بھری بھری پشت ایسی بھیگ جاتی کہ کرتا اس پہ چپکنے لگتا۔ مختار صاحب کی کھنکار سن کر وہ جلدی سے کھونٹی سے دوپٹہ اتارتی اور برائے نام سر پر ڈال لیتی مگر اس احتیاط سے کہ کم از کم سینہ ضرور ڈھک جائے۔ مختار صاحب اندر داخل ہوتے ہی سوال کرتے۔ ''منی کی ماں! کیا پکا لیا؟''

''اجی اڑد کی دال پکائی ہے۔''

''اڑد کی دال۔ بی بی یہ دالوں کا موسم نہیں ہے...... اچھا کل ہم کریلے لا کے دیں گے۔''

اور دوسرے دن جب مختار صاحب آتے تو ساتھ میں سیر ڈیڑھ سیر ہرے ہرے کریلے لاتے۔ دراصل اب ہر دوسرے تیسرے دن مختار صاحب کے کھیتوں سے کوئی ہری گیلی چیز پوسٹ ماسٹر صاحب کے یہاں پہنچنے لگی تھی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب جیسے خشک تھے ویسا ہی خشک ان کا صحن نظر آتا تھا لیکن اب کبھی خربوزوں کے بیج اور چھلکے بکھرے نظر آتے' کبھی بھنڈیوں کی پھرکنی جیسی جڑیں' کبھی ترئی کی چھیلن' کبھی بھٹوں کے چھلکے اور کبھی آموں کی زرد زرد گٹھلیاں۔

مختار صاحب اور پوسٹ ماسٹر صاحب چبوترے پر اب بھی اسی طرح گم متھان بنے بیٹھے رہتے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب اخبار پڑھتے پڑھتے تھک جاتے اور عینک اتارتے ہوئے زور سے جماہی لیتے اور مختار صاحب اخبار ہاتھ میں لیے لیے اونگھنے لگتے۔ لیکن پھرکھٹ سے اخبار ان کے ہاتھ سے گر پڑتا اور وہ چونک پڑتے۔ نے کی طرف ہاتھ بڑھتا۔ ''چلم ٹھنڈی ہو گئی۔'' پوسٹ ماسٹر صاحب بڑبڑاتے اور مختار صاحب چلم اٹھا کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلے جاتے۔

اندر پہنچ کر مختار صاحب کا انداز اب بدل بھی جایا کرتا تھا۔ وہ ہوں ہاں کرتے کرتے اچانک باتیں کرنی شروع کر دیتے اور کرتے چلے جاتے' فصلوں کی خرابی' بارش کی کمی'

کسانوں کی شرارتیں' گیہوں کی مہنگائی' نہ جانے کس کس موضوع پر وہ گفتگو کرتے اور رقیہ ہر گفتگو کو پوری یکسوئی سے سنتی۔ جس شوق سے وہ یہ خبر سنتی کہ اس مرتبہ خربوزوں کی فصل اچھی ہے' اسی انہماک سے یہ بات سنتی کہ اگلے برس مختار صاحب کے رہٹ کے لیے بیلوں کی نئی جوڑی خریدی جائے گی۔ واقعہ یوں ہے کہ اب رقیہ کی ویران مزاجی میں بھی فرق آ چلا تھا۔ گھر کے در و دیوار اب بھائیں بھائیں نہیں کرتے تھے۔ اور آنگن خالی خالی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ مختار صاحب کے کھیتوں سے آئی ہوئی ترکاریوں کے چھلکے جابجا بکھرے رہتے تھے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ مختار صاحب اکثر اوقات خود اس آنگن میں چولھے کے قریب ہی مونڈھے پہ بیٹھے نظر آتے تھے۔ ''اری مہترانی تیری بیٹی کا گونا کب ہو رہا ہے۔'' ''بتولن تیرا دھوبی اب تجھ سے لڑتا تو نہیں ہے۔'' ''بی بی ذرا دو گھڑی بیٹھ جا میں اکیلی ہوں۔ کمبخت اکیلے گھر میں دم الٹنے لگتا ہے'' اب اس انداز کی باتیں کرنے کی ضرورت خاصے دنوں سے پیش نہیں آئی تھی۔ ایک ہاتھ مشین کے ہتھے پہ ہے' منی کے فراک پہ بخیہ ہو رہی ہے۔ نگاہیں سوئی پہ جمی ہوئی' اور زبان زاہد کی متوقع شادی کے ذکر میں مصروف ہے۔ فراک کا کپڑا دیکھ کر مختار صاحب کو اس کپڑے کا بھاؤ پوچھنے کا خیال آتا اور پھر وہ کپڑے کی مہنگائی پر تفصیل سے گفتگو کرنی شروع کر دیتے۔ چولھے پہ بیٹھے بیٹھے رقیہ کو کسی اجنبی سی ترکاری' بہت کم استعمال ہونے والے ساگ کے متعلق خیال آ جاتا کہ اب کے برس اس کی صورت نہیں دیکھی۔ مختار صاحب سنتے اور دوسرے دن اس ترکاری کا ڈھیر لا کے رکھ دیتے۔ اروی کے پتوں کا رقیہ کو اسی انداز سے خیال آیا تھا اور دوسرے دن چولھے کے برابر سینی میں اروی کے اجلے سبز پتوں کی تھئی کی تھئی رکھی ہوئی تھی۔

مختار صاحب کو اروی کے تلے ہوئے پتوں سے کیا' کسی بھی کھانے کی چیز سے ایسی دلبستگی نہ تھی لیکن چونکہ رقیہ نے اپنے ہاتھ سے تلے ہوئے پتوں کی تعریف کی تھی اور خاص طور پر انہیں چکھنے کی دعوت دی تھی اور پھر کچھ نہ سہی اندر جانے اور باتیں کرنے کا ایک بہانہ تو تھا ہی' اس لیے انہوں نے اچھی طرح حقہ بھی تو نہیں پیا اور اٹھ کر اندر چلے آئے۔ رقیہ کو ان کی آہٹ کی ایسی پہچان ہو گئی تھی کہ ان کی کھنکار سنتے ہی اسے پتہ چل جاتا تھا کہ مختار صاحب آ رہے ہیں۔ سینی میں اروی کے پتے پھیلے رکھے تھے۔ کونڈے میں متھا ہوا بیسن رکھا تھا۔

چولھے میں آگ تیز تھی اور کڑھائی میں تیل کڑ کڑ بول رہا تھا۔ مختار صاحب کی آہٹ پر وہ چونکی اور ہڑ بڑا کر کھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چولھے کی آگ تیز تھی۔ اٹھتے ہوئے شعلوں نے لٹکتی ہوئی آستین کو چھو لیا۔ رقیہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور منہ سے ایک چیخ نکلی۔ مختار صاحب کھنکارنا وکھارنا بھول' جلدی سے اندر چلے آئے۔ ترت پھرت انہوں نے آگ بجھائی۔ آگ ایسی زیادہ تو نہیں لگی تھی۔ بس آستین جلی تھی۔ اور پورے بازو پہ سرخ سرخ آبلے پڑ گئے تھے۔ مگر رقیہ کے حواس ایسے گم ہوئے تھے کہ سدھ بدھ کی خبر نہ رہی۔ مختار صاحب کہنے لگے۔ ''کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ چولھے سے اٹھ جاؤ۔'' رقیہ چولھے سے اٹھ کر چارپائی پہ آ بیٹھی۔ پاس ہی پاندان رکھا تھا۔ مختار صاحب نے جلدی سے پاندان کھول' ہتھیلی پہ سارا چونا الٹا رقیہ کے بازو پر مل دیا۔ جہاں جہاں آبلے نظر آئے وہاں وہاں خوب لیپ کر دیا اور پھر بولے کہ بس اب آرام کرو۔ اللہ نے چاہا تو تھوڑی دیر میں بازو بالکل ٹھیک ہو جائے گا'' اور مختار صاحب خود اٹھ کر باہر چلے گئے۔

مختار صاحب دوسرے دن حسب دستور اپنے وقت پہ آئے۔ جلیبیاں کھائیں' اخبار پڑھنے لگے' حقے کے دو ایک گھونٹ لیے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ کل رقیہ کا بازو جل گیا تھا اور اس خیال کے ساتھ وہ اٹھ کر ہمیشہ کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے زنان خانے کی طرف چلے گئے۔

رقیہ اس وقت چوکی پر بیٹھی سینے کی مشین چلا رہی تھی۔ مختار صاحب کی آہٹ سن کر اس نے شانے پر بے قاعدگی سے پڑے دوپٹے کو سرکا کر سینے تک نیچا کر لیا اور پھر مشین چلانے میں مصروف ہو گئی۔ الٹے ہاتھ کی آستین بغل کے قریب تک چڑھی ہوئی تھی اور اس پر چونے کا لیپ جو اب خشک ہو چکا تھا۔ اسی طرح چڑھا ہوا تھا۔ مختار صاحب پوچھنے لگے۔ ''کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی اب؟''

''نہیں'' رقیہ نے مشین چلاتے چلاتے کہا۔

''اجی یہ تو تیر بہدف علاج ہے۔ کیسا ہی آدمی جل جائے چونا لگا لے بس فوراً ٹھنڈک پڑ جاتی ہے''

''اجی اللہ نے خیر کر دی۔'' رقیہ کہنے لگی۔ ''میں تو یہ سمجھی کہ بس میں جل ہی گئی۔''

''ہاں برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ خیر آج بازو کو دھو ڈالنا' کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔''

رقیہ نے سوئی کا الجھا ہوا دھاگا درست کیا اور پھر مشین چلانی شروع کر دی۔

منی بہت دیر سے چپکی بیٹھی باتیں سن رہی تھی۔ بازو کے سفید لیپ کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''امی جی آپ کے یہ بھبوت ملا کس نے ہے؟''

رقیہ اس سوال پر کچھ چونک سی پڑی۔ مشین کے ہتھے کو گھماتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اس نے بازو کو دیکھا اور جلدی سے دوپٹہ کا آنچل اس پہ ڈال لیا۔ مختار صاحب کی اخبار پہ جمی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں۔ رقیہ کی گھبرائی ہوئی آنکھیں مختار صاحب کی آنکھوں سے بس ایک لمحہ کے لیے لڑی ہوں گی اور پھر مشین کی سوئی پر جھک گئیں۔ مشین تیزی سے چلنے لگی۔ کانوں کی لویں لال پڑ گئیں۔ ایک لٹ سرخ ہوتے ہوئے رخسار پر آ پڑی اور چونے سے لیپے ہوئے پورے بازو میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ مختار صاحب کی نظریں پھر اخبار پر جم گئیں تھیں۔ مگر شاید وہ کوئی خاص خبر نہیں پڑھ رہے تھے۔ چونے کے لیپ کرنے کا پورا عمل ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور ان کی انگلیوں میں ایک نرم اور شیریں کیفیت کنمناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ چند منٹ تک اخبار پہ نظریں جمائے بیٹھے رہے اور پھر کھنکار کے آہستگی سے اٹھے اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر باہر چلے گئے۔

ایک سرور کی کیفیت' کچھ شرمندگی سی' ایک ندامت کا سا احساس' اسی کے ساتھ ایک عجیب قسم کی مسرت' طبیعت میں آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہوئی ایک مہک' انگلیوں اور مٹھیوں میں شیرینی سی گھلتی ہوئی' پوروں میں نرمی اور گرمی کے کسی عجیب سے امتزاج کو چھونے کا احساس' مختار صاحب عجب عالم میں گھر پہنچے۔ رستہ کیسے کٹا' کن کن گلیوں سے وہ نکل کر آئے' کس دکاندار نے انہیں سلام کیا' کسی بات کا انہیں پتہ نہ چلا۔ ہاں مگر گھر پہنچ کر یہ پوری کیفیت پل بھر میں زائل ہو گئی۔ زاہد بالکل غیر متوقع طور پر آیا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ خوش ہوئے یا نہ ہوئے ہوں۔ حیران بہت ہوئے۔

''میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ بوا جی بیمار ہیں' گھر پہ ان کی کوئی خبر لینے والا نہیں ہے۔ آپ تھوڑے دنوں کو وہاں چلے جائیں۔''

''میں..... مگر میں تو.....'' مختار صاحب سے جواب نہ بن پڑا۔ ''گھر اکیلا ...... ہاں

فصل تیار کھڑی ہے۔"

زاہد بگڑ کر بولا "دیکھا جائے گا فصل وسل کا...... آخر گھر پہ کوئی تو دیکھ بھال کرنے والا ہو۔"

رقیہ رات کو کھری چارپائی پہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ ایک عجب سا اضطراب ایک مبہم خوف اور اس خوف اور اضطراب کی تہہ سے ابھرتی ہوئی حسرتیں۔ جسم میں سلگنے کی دھیمی دھیمی کیفیت بیدار ہو چلی تھی۔ جسم جو سو چکا تھا۔ اس جسم کو سلانے کے لیے اسے کس کس کرب سے گزرنا پڑا تھا اور ترستی ہوئی طبیعت پہ کیسے کیسے جبر کرنے پڑے تھے۔ اور جب جسم سو گیا تو اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کبھی بیدار بھی تھا مگر چولھے کی آگ بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی' راکھ اندر سے گرم نکلی۔ اسے دس سال پہلے کی بیتی باتیں پھر یاد آ رہی تھیں' مگر ایک دھندلا سا خواب بن کر۔ کئی مرتبہ اس کا جی چاہا یہ خواب' اس خواب کا کوئی منظر پھر زندہ ہو جائے مگر پھر اس کا جی ڈوبنے لگتا اور ایک ملال اور افسردگی کی کیفیت اس کے عود کرتے ہوئے جذبے پر چھاتی چلی جاتی۔

صبح کو جب وہ سو کر اٹھی تو اس پہ خود ملامتی کی کیفیت طاری تھی۔ رات کے پراگندہ خیالات کا جب اسے دھیان آتا تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی اور اپنے آپ پر نفرین بھیجنے لگتی۔ اس نے پوری کوشش سے ان خیالات کو اپنے ذہن سے خارج کیا' منہ ہاتھ دھویا' الٹے بازو کو جسے وہ کل بھی دھو چکی تھی' ایک مرتبہ پھر دھویا۔ بازو ٹھیک ہو گیا تھا بس کہیں کہیں دکھن باقی تھی۔ گھڑونچی پہ سے کل کی خریدی ہوئی تریاں اٹھائیں اور ہنڈیا کے لیے انہیں چھیلنے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت تقریباً معمول پر آ گئی تھی۔ ایک دفعہ یونہی بے دھیانی میں اسے خیال آیا تھا کہ مختار صاحب اب آ بیٹھے ہوں گے اور اخبار پڑھ رہے ہوں گے' مگر پھر فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے خارج کر دیا اور تریاں زیادہ انہماک سے چھیلنے لگی۔

اتنے میں پوسٹ ماسٹر صاحب ایک چھوٹی سی گٹھڑی لیے اندر آئے اور چارپائی پہ رکھتے ہوئے بولے۔ "یہ پھلیاں مختار صاحب کے گھر سے آئی ہیں اور وہ تو گئے ہوئے ہیں۔"

"گئے ہوئے ہیں؟...... کہاں؟" رقیہ نے تری چھیلتے چھیلتے پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرف نظر اٹھائی۔

پوسٹ ماسٹر صاحب آہستہ سے بولے۔ "مختار صاحب کی اہلیہ بیمار ہے ان کا بیٹا آیا

تھا۔ ساتھ لے گیا ہے۔ تھوڑے دن وہ وہیں رہیں گے۔"

چاقو تری پہ چلتے چلتے رک گیا۔ رقیہ پوسٹ ماسٹر صاحب کو تکنے لگی۔ پھر فوراً ہی اس کی نظریں اپنے ہاتھ کی تری پہ اتر آئیں اور چاقو آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ "منی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جی امی جی۔"

"منی...... یہ پھلیاں اندر دالان میں رکھ دو۔" رقیہ کی آواز میں اداسی کی ایک خفیف سی دھاری شامل تھی۔

تریاں پھر چھلنے لگیں۔ چاقو آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

پوسٹ ماسٹر صاحب باہر آ کر پھر مونڈھے پہ بیٹھ گئے۔ دوسرا مونڈھا خالی پڑا تھا۔ انہوں نے اخبار خالی مونڈھے پہ رکھ دیا اور حقے کی نے ہونٹوں میں لے لی مگر چلم ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ حقے کی نے انہوں نے ایک طرف کی' عینک کی ڈبیا سے عینک نکال کر لگائی' مونڈھے پہ رکھے ہوئے اخبار کے بیچ کا صفحہ آہستہ سے نکالا اور پڑھی ہوئی خبروں کو ایک بار پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

جنگل

پتھر والے کنوئیں کے پاس سے اس نے شرافت اور نور کو جاتے دیکھا' زور سے آواز دی ''شرافت'' مگر یہ آواز بے اثر ثابت ہوئی۔ اس نے اور زور سے اور شرافت کے الف کو ذرا کھینچ کر آواز دی۔ ''شرافت'' شرافت اور نور نے مڑ کر دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔ قمرل نے دوڑ لگائی اور گھڑی بھر میں ان کے پاس جا پہنچا۔ قمرل نے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ رُخ کدھر کا ہے لیکن شرافت اور نور جواب کیا دیتے اس کا علم انہیں خود بھی نہیں تھا۔ شرافت تو بس منہ اٹھا کر چل پڑتا تھا اور منزل خود بخود متعین ہو جاتی تھی اور شرافت کے قدم جس طرف اٹھ جاتے تھے سب کے قدم لازمی طور پر اسی طرف اٹھتے تھے۔ دراصل ارادے کی اسی طاقت کے بل پر تو شرافت نے سب سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ چنانچہ شرافت نے قمرل کے سوال کا جواب ایسا ضروری نہ سمجھا۔ البتہ نور نے غیر واضح انداز میں جواب دیا۔ ''جنگل'' اور قمرل کے لیے یہ بہت واضح جواب تھا۔ شرافت اور نور اور قمرل پتھر والے کنوئیں کے چوک سے نکل کر نیم والی گلی میں ہو لیے اور نیم والی گلی سے اچھن کے گھر کے سامنے جا نکلے۔ اچھن اپنے چبوترے پر اکیلا کانچ کی گولیوں سے کھیل رہا تھا اور اس میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے ان کے آنے کی خبر بالکل نہ ہوئی۔ اچھن کو دیکھ کر شرافت قمرل اور نور تینوں کے چہروں پر ایک نیم محسوس سی کیفیت پیدا ہوئی اور آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک۔

نور لہک کر بولا۔ ''اچھن جنگل چلے ہے۔''

اچھن نے روکھے پن سے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''ابے چلا چل۔ امبیاں توڑ کے لاویں گے۔''

امبیوں کے لفظ پہ اچھن سوچ میں پڑ گیا۔ شرافت نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ''یار

نئیں چلتا تو جانے دے...... چلو'' اور وہ چل پڑا۔

اچھن کی قوت مدافعت جواب دے گئی۔ ''اچھا چل رہوں'' اور وہ ساتھ ہو لیا۔ کھڑی دوپہری' چاروں طرف ایک بولتا ہوا سناٹا' ایک شور اور ہنگامہ پیدا کرنے والی خاموشی' ایک عجیب سی سنسناہٹ' گویا کہیں دور بولتے ہوئے منجیروں کا ایک جلوس نکل رہا ہے۔ کبھی کبھی بہت بلندی پر کوئی چیل بولتی اور اس کی آواز ایک پراسرار پکار بن کر پوری فضا میں پھیلتی اور پھر معدوم ہوتی چلی جاتی۔ شرافت' قمرل' نور اور اچھن اس وقت مولا کے کھیت کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کھیت میں سوکھی ہوئی پیلی پیلی جڑوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ مولا کے چند کھیتوں سے قطع نظر سامنے خاصی دور تک میدان ہی میدان نظر آ رہا تھا اکا دکا درخت ضرور موجود تھے لیکن چلچلاتی دھوپ کے اثر سے ان پر نقاہت اور پژمردگی کی کیفیت طاری تھی۔ البتہ نیم کے ایک درخت نے شعاعوں کا اثر کم قبول کیا تھا اس کے پتے بھی نسبتاً زیادہ سبز نظر آ رہے تھے اور اس کی شاخیں چند کوّوں کے لیے گوشہ عافیت بنی ہوئی تھیں۔ یہ کوّے سو تو نہیں رہے تھے لیکن بیٹھے تھے بالکل چپ چاپ۔ ایک کوّے کی چونچ کھلی ہوئی تھی۔ اس کی سرخ زبان کانپتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی اور اس کی ایک آنکھ اک ذرا ابلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے قریب ہی ایک ٹیلہ تھا۔ جس کی چوٹی پر دو تین گدھ دھوپ کے احساس سے بے تعلق آنکھیں بند کیے اونگھ رہے تھے۔ یہ تو خیر سب ہی جانتے تھے کہ اس ٹیلے کی تلیہٹی میں ایک بھٹ ہے اور اس میں ایک سیہہ رہتی ہے۔ ہاں یہ تجویز شرافت نے پیش کی تھی کہ اس بھٹ کو چل کر دیکھنا چاہیے۔ لیکن جتنا آگے بڑھتے گئے رفتار دھیمی پڑتی گئی۔ قمرل شروع میں سب سے آگے تھا لیکن اب وہ سب سے پیچھے ہو گیا تھا۔ اچھن کا دل اندر سے زور سے دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ وہ کھسک کر قمرل کے برابر ہو گیا۔ رفتار نور کی بھی سست پڑ گئی تھی لیکن اسے رہ رہ کے خیال بھی آ رہا تھا کہ کوئی اس پہ ڈرپوک پن کی تہمت نہ لگا دے اور پھر ایک ساتھ سب رک کے کھڑے ہو گئے۔ یوں شرافت بھی سب کے ساتھ ہی رک کر کھڑا ہوا تھا۔ پھر اسے فوراً ہی اپنی اور دوسروں کی حرکت پہ تاؤ آ گیا۔ ''بس ڈر گئے؟''

قمرل بولا۔ ''بیٹا سئے نکل پائی تو سب کے سب مارے جاؤ گے۔ اس کے سارے بدن پر کانٹے ہی کانٹے ہو وے ہیں۔''

"میں بتاؤں ایک ترکیب؟" شرافت سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا؟"

"سب اینٹیں اٹھالیں۔ اگر سَے ہوئی تو اینٹوں سے مار مار کے سالی کا بھرکس بھر دیں گے۔"

"ہوں" قمرل تحقیر آمیز انداز میں بولا۔ "اینٹوں سے مرے گی۔ لٹھیا تک سے تو وہ مرتی نئیں۔ بس اگر رسی ہو کسی کے پاس تو گھمانے لگے۔ پھر وہ پاس نئیں آ سکتی۔"

شرافت نے سب کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ "ڈرپوک سالے" اور یہ کہہ کے وہ ان سے ٹوٹا اور سیدھا ٹیلے کی طرف ہولیا۔

اچھن دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف سرکا اور نور اور قمرل کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ قمرل کا دل ہی نہیں کانپ رہا تھا بلکہ ٹانگوں میں بھی ہلکی سی تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔ اچھن کا سامعہ اچانک غیر معمولی طور پر حساس ہو گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ شرافت کی چیخ کی آواز آئے اور وہ بھاگ چھٹے۔ ایک مرتبہ واقعی ایسا لگا کہ شرافت چلا رہا ہے لیکن اس لحہ اس کے حواس ایسے غائب ہوئے کہ وہ بھاگنا واگنا سب کچھ بھول گیا۔ نور واضح طور پر کچھ سوچ تو نہیں سکا بس اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں اور ایک بے نام سا خوف اس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔ کئی مرتبہ اس نے قمرل سے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز سینے کے اندر ہی کہیں گم ہو گئی۔ قمرل کی آنکھوں میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا تخیل بہک نکلا تھا۔ ٹیلے کی تلہٹی والا بھٹ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ بھٹ نہیں غار۔ اندھیرا' شرافت دبے پاؤں بڑھ رہا تھا لیکن اس کے قدموں کی دھمک غار میں جا پہنچی۔ اندھیرے میں جیسے سیہہ نے سر نکالا ہو۔ اس نے زور سے ایک پھریری لی اور اس کے بدن کے سارے کانٹے تیروں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

"قمرل۔" قمرل' نور' اچھن تینوں کے تینوں ایک ساتھ چونک پڑے۔ شرافت خوش خوش چلا آ رہا تھا۔

"چلو۔" شرافت کے قدم بہت تیز تیز اٹھ رہے تھے۔

نور' قمرل' اچھن تینوں تیز تیز اس کے ساتھ چل رہے تھے اور ان کی جستجو آمیز نگاہیں

اس کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ آخر نور سے نہ رہا گیا۔ "تھی؟"

شرافت نے اپنی مٹھی سامنے کر دی۔ نور' قمرل' اچھن تینوں کی آنکھوں میں ہیبت سی چھا گئی۔ شرافت مٹھی چہروں کے بالکل قریب لے گیا اور آہستہ سے مٹھی کھول دی۔ "سَے کا کانٹا؟" سب چونک پڑے۔

"ہوں۔" شرافت پھول کے کپا ہو گیا۔

نور نے ہاتھ بڑھایا "دکھائیو یار۔"

"دینے کی علت ہے۔ دور سے دیکھ لو۔"

"اچھا اِترانے لگے سالے۔"

شرافت نور کے طعنے کا جواب اس کے سوا کچھ نہ دے سکا۔ "ہاں اتراؤں ہوں' بس' بس' کچھ کر لو میرا۔"

قمرل خاموشی سے چلتے ہوئے بولا۔ "شرافت کانٹا پھینک دے۔"

"کیوں پھینک دوں" شرافت نے تنک کر جواب دیا۔

قمرل نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "سَے کا کانٹا منحوس چیز ہے۔ لڑائی ہو جاوے ہے اس سے۔"

"چل بے بھتنی کے۔ میں اس کا قلم بناؤں گا۔"

فضا کی حدت بدستور قائم تھی۔ ہاں شاید لو چلتے چلتے رک گئی تھی یا پھر اس کی رفتار اتنی دھیمی ہو گئی تھی کہ زمین کی بھنتی ہوئی ریت اور درختوں کی نڈھال پتیوں پر اس کا اثر نظر نہیں آتا تھا۔ فضا میں بہت بلندی پر جو چند چیلیں نظر آ رہی تھیں وہ اب اور بلند ہو گئی تھیں۔ اور ان کے ساکت بازوؤں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ گرم شعاعوں نے ان کے جسموں کی گرمی اور حرکت کو چوس لیا ہے اور وہ خشک ہو گئی ہیں۔ ساکت و ساکن ہو گئی ہیں۔ اچھن ٹولی سے ایک ذرا کٹ کر ریت کو اس طرح دیکھتا چل رہا تھا گویا کوئی چیز ڈھونڈھ رہا ہے۔ ایک دفعہ اسی طرح چلتے چلتے اسے نیلے شیشے کا ٹکڑا مل گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ اسے پیسہ بھی ملا تھا۔ ایک دو مرتبہ وہ ٹھٹکا چاروں طرف ریت ہی ریت اور بیچ میں ایک گول سی صاف شفاف جگہ۔ اچھن کو خیال گزرا کہ کہیں یہاں خزانہ تو دفن نہیں ہے۔ لیکن پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس جگہ کو

بلی چاٹ گئی ہے اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن ایک دفعہ وہ چلتے چلتے واقعی حیرت سے رک کر کھڑا ہو گیا۔ نور' قمرل اور شرافت باتیں کرتے کرتے پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے مڑ کر آواز دی۔

''ابے یاریاں آئیو۔ دیکھنا کتنا بڑا پیر ہے۔'' نور' قمرل اور شرافت لپکے ہوئے آئے اور سب کی نگاہیں پیر کے ایک بڑے سے نشان پہ جم گئیں اور سب کی نگاہوں میں تحیر کی ایک کیفیت تیرنے لگی۔

نور حیرت سے بولا۔ ''یار بہت بڑا پیر ہے۔ کس کا پیر ہے یہ؟''

قمرل کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے غور سے سب کی طرف دیکھا اور بولا ''بتاؤں کس کا پیر ہے۔''

''ہاں بتا۔'' سب کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جم گئیں۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سب کو حیرت زدہ نگاہوں سے گھورا۔ حیرت زدہ نگاہیں' حیرت جو بھید پانے کے بعد پیدا ہوتی ہے اس کی آواز میں سرگوشی کا انداز پیدا ہوگیا۔ ''بتاؤں کس کا پیر ہے...... جن کا''......

سب پہ سکتہ طاری ہوگیا۔ اچھن کا دل ایک مرتبہ پھر زور زور سے دھڑکنے لگا نگاہوں کا تحیر کچھ اور گہرا ہوگیا۔ اب اس میں خوف و ہراس کا بھی رنگ شامل تھا۔ شرافت چند لمحے تو بالکل خاموش کھڑا رہا اور پھر ایک ساتھ ہنس پڑا۔ ''جن کا پیر ہے۔'' اس کے لہجہ میں تضحیک کا پہلو شامل تھا۔ ''کسی سالے اجڈ گنوار کا پیر ہوگا۔ چلو بے چلو' اور یہ کہہ کے وہ آگے بڑھ لیا۔ قمرل' نور اور اچھن بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ لیکن انہیں شرافت کا یہ انداز مطلق نہ بھایا۔

''شرافت سالے تو مارا جائے گا کسی دن۔'' قمرل کی آواز ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔

شرافت پھر ہنس پڑا۔ ''یار مجھے جن کبھی نئیں دکھائی دیا۔''

نور اک ذرا غصے سے بولا۔ ''یار جی کسی روز الٹے ہو جاؤ گے۔ ساری سورمائی رکھی رہ جائے گی''

قمرل نے ٹکڑا لگایا۔ ''اچھا تو بہت جودھا ہے تو۔ رات کو کسی دن مقبرے پہ جا کے دکھا''

''اور چلا گیا تو؟'' شرافت نے گرما کر جواب دیا۔

قمرل کو ہرگز توقع نہ تھی کہ شرافت اس کا چیلنج اس آسانی سے قبول کرے گا۔ اس نے

یک شرط کا اضافہ اور کر دیا۔ ''جمعرات کی رات ہو مگر۔''

''ہاں جمعرات کی رات ہوگی۔'' شرافت نے اسی نڈر پن سے جواب دیا۔

قمرل زچ ہوگیا' بولا۔ ''اچھا تو اب کی جمعرات کو جائیو۔ اکنی کی مٹھائی کھلاؤں گا تجھے۔''

''مگر یار'' نور کہنے لگا۔ ''وہ ستاتے نئیں ہیں۔ سید صاحب ہیں۔ ایک دفعہ کیا ہوا......'' نور ذرا چپ ہوا۔ اب ساری نگاہیں اس کے چہرے پہ جم گئی تھیں۔ اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ''ایک دفعہ کیا ہوا کہ میں ادھر سے آرہا تھا۔ وہ گنبد ہے نئیں بیچ والا......''

''ہوں۔''

''میں نے جو ادھر دیکھا...... تو کیا دیکھوں ہوں کہ اس پہ ...... ایک سفید کبوتر بیٹھا ہے۔'' سفید کے لفظ پہ اس نے خاص طور پر زور دیا اور پھر...... اسمائے صفت سے اس میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''بالکل سفید چونا۔''

اچھن اور قمرل کی آنکھوں کی وہ تحیر والی کیفیت جو دھیمی پڑ گئی تھی اب پھر عود کر رہی تھی۔ شرافت بھی پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ نور رکا اور پھر بولا۔ ''اچھا تھوڑی دیر بعد جو میں نے مڑ کے دیکھا تو کبوتر غائب۔''

''کبوتر غائب؟''

''ہاں کبوتر غائب اور اس کی جگہ ایک سفید پوش آدمی۔ بالکل سفید براق......''

شرافت غور سے سن رہا تھا اور اچھن اور نور کی آنکھوں میں خوف و ہراس کا رنگ پھر شامل ہو چلا تھا اور تخیل پھر بہک چلا تھا۔

چاندنی رات' مقبرے کے احاطہ میں جابجا گھنے درخت کھڑے تھے۔ ان چپ چاپ گھنے درختوں پہ ایک پراسرار سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ نیم کا ایک گھنا درخت ایک گنبد کے سائے میں ہونے کی وجہ سے چاندنی کے طلسم سے محفوظ ہوگیا تھا۔ اس کی گھنی شاخوں میں کوئی چھپا بیٹھا تھا۔ کون؟ یہ بالکل پتہ نہیں چلتا تھا۔ درخت خاموش تھے۔ فضا میں ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔ بیچ والے گنبد پہ ایک بڑا سا سفید کبوتر پروں میں چونچ دیئے بیٹھا تھا۔ اس نے چونچ نکال کے گردن اٹھائی۔ گردن بلند ہوتی چلی گئی اور ایک سفید پوش سایہ نظر آنے لگا۔ وہ بلند

ہوتا گیا۔ بلند ہوتا گیا......

قمرل نے جھرجھری لی۔ ''یار مڑ کے نئیں دیکھنا چاہیے۔ مڑا اور مارا گیا۔ میں اسی میں مارا گیا تھا۔''

اور سب کی نگاہیں قمرل کے چہرے پہ جم گئیں۔

''امتحانوں کے دنوں میں رات کو غیور بھائی کے پاس سے پڑھ کے آرہا تھا'' قمرل کی آنکھوں اور لہجے دونوں میں ایک بھید بھری کیفیت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ ''بارہ بجے کا وقت' ساری سڑک سنسان۔ میں دل ہی دل میں قل پڑھنے لگا۔ نیم والی گلی میں جو گھسا تو میرا دل آپ ہی آپ دھک دھک کرنے لگا۔ میں جلدی جلدی چلا۔ نیم کے پاس جو پہنچا تو کیا دیکھوں ہوں کہ...... بندر' یہ موٹا بندر' منہ لال انگارہ۔ بھورے بھورے بال' دم اٹھائے' بال پھلائے کھڑا تھا۔ میری جان سن سے نکل گئی۔ میں نے بھیا نادعلی شروع کر دی اور چلا واں سے جلدی جلدی۔ گلی کے نکڑ پر جو پہنچا تو میں نے مڑ کے دیکھا...... یار...... یار وہ بندر تو پچھلی دونوں ٹانگوں پہ کھڑا تھا۔ لمبا ہوتا گیا۔ لمبا ہوتا گیا۔ بانس برابر لمبا ہوگیا اور اگلے پیروں سے نیم کا گدا پکڑ لیا۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے آنکھیں میچ لیں اور لگائی واں سے دوڑ۔''

قمرل چپ ہوگیا۔ سب کی آنکھوں میں دہشت کی ایک کیفیت تیر رہی تھی اور دل دھڑک رہے تھے۔ اچھن چلتے چلتے پھر قمرل اور نور کے بیچ میں آکر چلنے لگا تھا۔ دو چیلیں ایک دوسرے پہ سوار پوری شدت سے چیختی ہوئی تیزی سے نیچے آرہی تھیں۔ دہشت زدہ نگاہیں کچھ اور دہشت زدہ ہو کر اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ دونوں چیلیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا نیچے ہوتے چلی گئیں۔ اور پھر خود بخود الگ الگ ہوگئیں اور نڈھال ہو کر پھر اوپر کی طرف اڑنے لگیں۔ آندھی تو نہیں ہاں تیز لو چلنے کی وجہ سے آندھی سے ملتی جلتی فضا ضرور پیدا ہو چلی تھی۔

پوری فضا میں بدرنگ زرد ذرّوں کا سیلاب بہتا نظر آرہا تھا۔ ایک مرتبہ ایک تیز سا جھونکا اٹھا اور گرد کی بلند ہوتی ہوئی مٹیالی موجیں قمرل' شرافت' نور اور اچھن کے سامنے بہت دور تک بہتی ہوئی چلی گئیں۔ اچھن کے چہرے پر ایک اور پرچھائیں کانپتی نظر آئی اور اس کی انگلی سامنے کھیت کی طرف اٹھ گئی اور انگلی کے ساتھ ساتھ ساری نگاہیں اس طرف مرکوز ہو گئیں۔

عورت'' مینڈھ سے اتر کر اجڑے ہوئے کھیت کے بیچوں بیچ ایک عورت دوسری طرف چلی رہی تھی۔ لمبی تڑنگی' چوڑی چکلی' رنگ کالا تو گلے میں چاندی کی ٹکلیوں کا ہار' سرخ رنگ کا میلا نگا' ہاتھ میں کھرپا' گاڑھے کی چادر لپٹی ہوئی اس کے سر پر رکھی تھی۔

قمرل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''چڑیل''

نور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اچھن نے نور کا ہاتھ زور سے بھینچ لیا۔ اس نے ں پڑھنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کی زبان نے کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا دل ھڑک رہا تھا لیکن زبان بند تھی۔ شرافت نے ایک پھریری لی۔ ''چڑیل ہے۔'' اور یہ کہہ کے وہ پ کر عورت کی طرف چلا۔ اچھن نے نور کا ہاتھ اور زور سے بھینچ لیا۔ قمرل نے دل ہی دل ں نادعلی پڑھنی شروع کر دی۔

شرافت کچھ دور تک عورت کے برابر چند قدم کے فاصلے سے چلتا رہا اور گھور گھور کے ں کی صورت دیکھنے لگا۔ اس کا دل اک ذرا تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ عورت نے پہلے تو اس ی طرف دھیان نہیں دیا لیکن جب اسے مسلسل گھورتے دیکھا تو چلتے چلتے اس کی طرف مڑی ور بولی۔ ''کیا دیکھے ہے ہے لالا موکو۔'' شرافت نے ایک قہقہہ لگایا اور مڑ کے پیچھے کی طرف ھاگ پڑا۔

''حد ہوگئی گھسیارن کو چڑیل بتا دیا۔'' یہ کہتے ہوئے شرافت نے اپنے چپل زمین پہ الے اور پیروں میں پہن لیے۔

''چڑیل نہیں تھی؟'' قمرل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''نہیں۔'' شرافت نے اسی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''نہیں۔'' قمرل آواز کو بگاڑتے ہوئے بولا۔ ''اس کے پیر دیکھے تھے؟ پیچھے کی طرف تھے۔''

شرافت ہنس پڑا۔ ''ابے قمرل تیری آنکھیں ہیں یا چوہے کے بھٹے ہیں۔ اس کے پیر تو بالکل آگے کی طرف تھے اور بتاؤں نشانی۔ اس نے پیروں میں بچھوے پہنے ہوئے تھے۔''

قمرل لاجواب ہوگیا۔ نور اور اچھن کا خوف بھی رفو چکر ہوگیا۔

اب وہ بدھا والے آموں کے باغ سے آن لگے تھے۔ دھوپ نے ان کا برا حال کر دیا

تھا۔ آم کے گھنے درختوں کے نیچے پہنچے' ذرا ٹھنڈی ہوا لگی اور دم میں دم آیا۔ شرافت نے اپنے چپل اتار کر جھاڑے' پھر اپنے پیر جھٹکے اور پھر چپل پہن لیے نور اور قمرل ننگے پیر تھے۔ انہوں نے اپنے پیر بے پروائی سے جھٹکے اور فراغت پالی۔ اچھن نے بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس نے آم کے پتوں سے پہلے اپنے بوٹوں کی گرد صاف کی' پھر آستین سے اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا۔ دھوپ کے اثر سے اس کا گورا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ شرافت اور قمرل آگے بڑھ لیے' لیکن نور نے اچھن کو چھوڑ کے آگے نکل جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بوٹ اچھی طرح صاف نہیں ہوئے تھے۔ اس مرتبہ نور نے آم کے دو بڑے سے ہرے ہرے پتے اٹھائے اور اس کے بوٹوں کو اچھی طرح صاف کیا۔ بالوں کی گرد کا احساس اچھن کو نور کے کہنے پر ہی ہوا اور نور نے اپنے ہاتھ سے اس کے سنہری بال صاف کیے۔ بالوں کو جھاڑتے جھاڑتے اس کی انگلیاں اچھن کے گال سے چھو گئیں۔ اچھن کے گال میں شہد کے ننھے ننھے رسیلے قطرے کنمنانے لگے اور نور کی انگلیوں کے پوروں میں ایک شیریں رو تیر گئی۔ یہ شیریں رو انگلیوں کی پوروں میں سے نکل کر سارے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اچھن کے بال پھر اسی بے احتیاطی سے صاف کرے۔ لیکن اچھن کے رخساروں پر سرخی پھیل رہی تھی۔ وہ الگ ہٹ گیا۔ ''بس یار جھڑ گئے بال۔''

اچھن کو چلتے چلتے کئی بار احساس ہوا کہ اس کے بالوں میں ابھی گرد باقی ہے اور بے دھیانی میں کئی بار اس کی انگلیاں اوپر کی طرف بڑھیں۔

''مور کا پر'' اچھن نے لپک کر اور کچھ حیرت سے کہا۔

نور نے بڑھ کر مور کی دم کا لمبا سا چمکدار پر اٹھا لیا۔ پھر اس نے یہ پر اچھن کو دے دیا۔
نور اور اچھن کی دوستی اور گاڑھی ہو گئی' اتنی گاڑھی کہ نور اچھن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ لیکن صرف چند قدم تک۔ اچھن کے گال تمتمانے لگے اور اچھن اور نور دونوں کے جسموں میں ایک بے نام خوشگوار جھنجھناہٹ سی پھیل گئی۔

''گرمی لگ رہی ہے یار۔'' اور اچھن الگ ہٹ کر چلنے لگا۔

شرافت اور قمرل چلتے چلتے ایک ساتھ چونکے۔ سب سے پہلے یہ خیال قمرل کو آیا کہ نور اور اچھن اتنے پیچھے کیوں رہ گئے ہیں۔ اس نے شرافت کو ٹہوکا۔ شرافت نے زور سے آواز

ں۔ ''ابے نور سالے کچی امبیا مت توڑ۔''

نور اور اچھن ہڑ بڑا گئے۔ انہوں نے اپنی چال تیز کر دی۔ اچھن کے چہرے پہ سرخی ایک ہلکی سی لہر بھی نمودار ہوئی تھی لیکن پھر فوراً ہی زائل ہو گئی۔ اسے ڈبکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ں کسی اور رخ نہ چل پڑیں۔ اس نے قریب پہنچتے ہی قمرل کو مخاطب کیا۔ ''قمرل' ہمیں مور کا ا۔''

شرافت نے تو اس بات کو گول کر کے کچھ اور ہی بات کرنے کی ٹھانی تھی۔ لیکن قمرل کی ی رگ نے کام بگاڑ دیا۔ بہکنے کا اشارہ ملا اور وہ بہکا۔ مور کے پر نے اس کے تخیل کو بے لگام ر دیا۔ حیرت سے بولا۔ ''مور کا پر...... یار یاں مور ناچا ہوگا؟''

اچھن کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔ ''قمرل تو نے مور کو ناچتے دیکھا ہے؟''

''میں نے دیکھا ہے۔'' نور تڑ سے بولا۔

قمرل نے نور کے فقرے کو نظر انداز کر دیا اور کہنے لگا۔ ''یار! ناچنے میں مور کی دم ایسی ڑی ہو جاوے ہے جیسے کوئی نیلی چھتری ہو' مگر یار...... جب ناچ چکتا ہے تو اپنے پیروں کو یھ کے اس کے آنسو نکل آوے ہیں۔''

پر کو گالوں سے مس کرنے میں اچھن ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا جیسے نرم پتلی پتلی لیاں اسے چھو رہی ہوں۔ ایک عجیب سی مٹھاس' ایک رسیلی کیفیت' پر کو گالوں سے مس کرتے رتے اس نے اسے آنکھوں پہ ڈھک لیا اور چمکیلے نیلے اور سنہری ریشوں میں سے شربتی نکھیں کبھی جھانکتی تھیں کبھی ان میں چھپ جاتی تھیں۔ اچھن نے پر ذرا نیچے کیا اور پوچھنے ا۔ ''قمرل'' اس کی آنکھوں میں حیرت کی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ''مور کے پیر صورت کیوں ہووے ہیں۔''

شرافت ہنستے ہوئے بولا۔ ''سالے نے ایک دن آم کے پیڑ کی چھال پنجوں سے کرید الی۔ اس میں لگا ہوا تھا گوند۔ بس وہ چھال اس کے پنجوں سے چپک گئی۔''

قمرل اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ شرافت سالا تو مذاق کرے ہے۔ میں بتاؤں ت یہ ہوئی کہ سانپ اور مور دونوں بہشت میں تھے۔ انہوں نے شیطان کے بہکائے میں کے حضرت حوا کو ورغلایا تھا۔ اللہ میاں کو آیا غصہ۔ سانپ کے تو انہوں نے پیر ہی صاف کر

دیئے کہ بیٹا زمین پہ گھسٹتے پھرو۔ اور مور کے پیر کبوتر کو دے دیئے اور کبوتر کے پاؤں مور کے لگا
دیئے اور کہا کہ بچو بہشت سے ٹڈی ہو جاؤ۔''

''ابے او سالو۔'' شرافت دبی آواز میں پکارا۔ وہ ان سے ٹوٹ کر ایک گھنے سے آم
کے درخت کے نیچے جا پہنچا تھا۔ جس کے گدے جھک کر اس کے سر کو چھو لینے کی کوشش
کر رہے تھے۔ قمرل' نور اور اچھن نے اسے دیکھا۔ پھر ہری ہری امبیوں سے لدے ہوئے
گدوں کو۔ اور دبے پاؤں شرافت کی طرف چلے۔ کئی سوکھے پتے اچھن کے بوٹ کے نیچے
آ گئے اور ایک ساتھ چرمر کی آواز پیدا ہوئی۔ قمرل نے دبی آواز میں ڈانٹا۔ ''کیا کر رہا ہے
بے اچھن'' اچھن اور ہولے ہولے چلنے لگا۔ تینوں چپکے چپکے شرافت کے پاس جا پہنچے۔
شرافت نے منہ پر انگلی رکھی۔ اور دھیرے سے بولا۔ ''چپ'' پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ آم
کے ایک گدے کی طرف بلند ہونے لگا۔ قمرل اور نور کے ہاتھ بھی دھیرے دھیرے اوپر اٹھ
رہے تھے۔ ہرے ہرے پتوں میں چھپی ہوئی ایک امبیا جھک کر اچھن کے رخسار کو چھو رہی
تھی۔ اچھن کا جی چاہا کہ وہ اسی طرح کھڑا رہے۔ باغ کے دوسرے کونے سے ایک کڑک دار
آواز آئی۔ ''کون ہے بے'' اور سب کے سب ایک دم سے بھاگ چھٹے۔

آموں کے باغ سے نکل کر وہ بہت دور تک بھاگتے چلے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی
رفتار دھیمی پڑتی چلی گئی۔ قمرل دوڑتے دوڑتے رکا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ بری طرح ہانپ
رہا تھا۔ شرافت نے زمین پہ چپل ڈالے اور پہن لیے۔ ان کی دیکھا دیکھی نور نے بھی دوڑنا بند
کر دیا۔ اچھن سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے لیے انہیں کئی منٹ کھڑے ہو کر انتظار کرنا
پڑا۔ سامنے کچھ دور دھرم شالا والی رہٹ چل رہی تھی۔ وہ خربوزوں کی باڑی والی مینڈھ پہ پڑ
لئے۔ خربوزے' ککڑی اور کریلے کے کھیت دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ مینڈھ کے بیچوں بیچ
نالی بنی ہوئی تھی جس میں صاف شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ وہ مینڈھ مینڈھ کنوئیں پہ پہنچ گئے۔
رہٹ اپنی ایک سی رفتار سے چلے جا رہی تھی۔ بیل ہانکنے والے کسان کو تو کسی اور طرف دھیان
دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ بار بار نشیب میں جا کر ان کا جوا کھولتا' انہیں ہانک کر چبوترے پر
لے جاتا' جوا چڑھاتا اور پھر نشیب کی طرف انہیں ہانکتا۔ لیکن کنوئیں پر جو کسان کھڑا تھا وہ
اپنے کام کو بھول کر کسی اور ہی کیفیت میں گم تھا۔ چرس جب کھنچ کر کنارے پہ آتی تو وہ اسے

م کر اوپر کی طرف زور لگاتا اور ساتھ میں پوری ترنگ سے گاتا۔

ایک پھول پھولے کھڑی دو پہر یا دوسرا پھول پھولے آدھی رات' ہو گوریا

بھینسیا رنگ کی چرس اس کے پیروں پہ آ پڑتی اور سفید سفید سیال پھول اس کے قدموں پر
پتھر پر بکھر جاتے۔

کنوئیں کے پاس ہی چوبچہ بنا ہوا تھا۔ نور اور قمرل نے چوبچے پر پہنچتے ہی اپنے گرد میں
ٹے ہوئے پیر پانی میں ڈال دیئے۔ شرافت نے اپنے چپل اتار کے دور ایک طرف پھینک
یے اور اچھن نے اپنے بوٹ اتار کے پاس ہی احتیاط سے رکھ دیئے۔ اچھن نے نیکر پہن
ا تھا اور اس لیے اسے پائینچے چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اجلے پانی میں بھیگ کر اس
ں گوری ٹانگیں اور زیادہ گوری نظر آنے لگیں۔ اس کی رانیں تو بالکل چکنی تھیں۔ البتہ پنڈلیوں
بہت ہلکا ہلکا نرم ریشمی سنہری رواں نظر آ رہا تھا۔ اس کی نرم گوری رانوں کو دیکھ کر کچھ ایسا لگتا
ا کہ اللہ میاں نے سونے کی پتریاں جما کر اس کی پٹیں بنائی ہیں۔ اس نے نیلا نیکر پہن رکھا
ا جو پیچھے سے کچھ زیادہ چست ہو گیا تھا۔ یا شاید جسم کی چستی کی وجہ سے چست نظر آ رہا تھا۔
ست نیکر کو دیکھتے دیکھتے نور کا ذہن باڑی کے زرد زرد خربوزوں کی بیٹوں کی طرف منتقل ہو
گیا۔ اس نے منہ نیچے کر لیا اور دونوں چلوؤں میں پانی لے کر منہ پر زور زور سے چھپا کے
رنے لگا۔ اس نے پھر اچھن کی طرف دیکھا۔ دھوپ سے تمتماتے ہوئے سرخ پھولے ہوئے
گال اب پانی سے بھیگ کر ایک نئے انداز سے لو دے رہے تھے۔ وہ تمتماہٹ کی کیفیت ختم ہو
چکی تھی اور ایک نئی کیفیت پیدا ہو رہی تھی' کچھ ایسی کیفیت جو گلاب کے پھولوں پر پانی چھڑکنے
کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ سنہری بال بھیگ کر پیشانی سے نکل کر شربتی آنکھوں پر آن لٹکے تھے۔
ور نے منہ پر پانی کا ایک چھپا کا مارا اور گردن اسی طرح سے جھکائے ہوئے بولا۔ ''اچھن۔''
ور جب اچھن نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا
پڑا۔ اچھن کے کان کی بھیگی لویں سرخ پڑ گئیں۔

قمرل اور شرافت منہ ہاتھ دھو کر گھاس پر جا بیٹھتے تھے۔ پھر اچھن قمیص سے منہ پونچھتا
ہوا آیا اور گھاس پہ لیٹ گیا۔ چند منٹ تک وہ چت لیٹا رہا اور پھر پٹ ہو گیا۔ نرم نرم ہری ہری
گھاس اور ٹھنڈی ہوا۔ اس نے اپنا رخسار گھاس پہ رکھ دیا۔ ایک غنودگی' ایک سپردگی کی کیفیت

اس پہ طاری ہونے لگی۔ آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ ایک نرم مخملیں آغوش اسے اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچ رہی ہے' بھینچ رہی ہے۔ آنکھیں بند کرلیں اور اپنے آپ کو اس نرم مخملیں آغوش کے حوالے کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس ان دیکھی نرم آغوش میں سما جائے' گم ہو جائے۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے بھیگے بالوں میں کوئی انگلیاں پھیر رہا ہے۔ مبہم غنودگی آمیز کیفیت کی ایک اور لہر اٹھی اور اس کے حواس پر چھا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ یہ انگلیاں اس کے بھیگے بالوں میں اسی طرح حرکت کیے جائیں اور اس کا احساس زیادہ غیر واضح اور زیادہ لذت آمیز ہوتا چلا گیا شرافت نے بظاہر تفریحاً اچھن کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کی تھیں۔ لیکن بھیگے بالوں میں اس نے صرف ٹھنڈک ہی محسوس نہیں کی بلکہ حلاوت کی ایک مبہم اور انجانی کیفیت بھی محسوس کی اور اس نے اک ذرا ڈر کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ حلاوت کی وہ کیفیت مبہم اور انجانی تھی۔ یہ ڈر بھی مبہم اور اجنبی تھا۔ ویسے اس نے قمرل پہ اپنا حال واضح نہیں ہونے دیا۔ شاید قمرل اس کی طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں تو اچھن کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں اور ان میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی جارہی تھی' اس کیفیت سے مختلف جو نیم والی گلی کے بندر کی کہانی سناتے وقت پیدا ہوئی تھی۔

پھر وہ آہستہ سے شرافت سے مخاطب ہوا۔ ''شرافت۔''

شرافت نے چونک کر اسے دیکھا۔

''شرافت یار'' وہ شرافت کے بالکل برابر سرک آیا اور رازداری کے انداز میں بولا۔

''رنگ آرہا ہے۔'' شرافت کی آنکھوں میں پہلے تو بے اختیاری طور پر ایک نرم سی مسکراہٹ کھیل گئی مگر پھر فوراً ہی اس کا رنگ بدل گیا۔ بے اعتنائی سے ہنس کر بولا۔ ''قمرل سالے تو بالکل چونگھٹ ہے۔''

قمرل نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور پھر بولا۔ ''شرافت یہ سالا نور بہت چھانکتا ہے۔''

شرافت تن گیا۔ ''جانے دے یار۔ جب تک میں دل پہ نئیں دھرتا ہوں' بس اسی وقت تک چھانکتا ہے۔''

قمرل نے طعن آمیز انداز میں جواب دیا۔ ''پیارے اب تم ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔''

چ چھا۔'' شرافت اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔''

میاؤ' میاؤ...... میاؤ۔ مور کی نغمہ آگیں جھنکار بلند ہوئی اور تپتی فضا میں ایک شاداب ہر دور تک کھنچتی چلی گئی۔ قمرل کو جھرجھری آئی۔ ''نورا بے' ابے او نورا' ابے سالے' مور۔''

نور جھٹ پٹ چوبچے سے نکلا' قمیص کے دامن سے منہ پونچھا اور شرافت اور قمرل کے تھ لگ لیا۔ ''کہاں تھا یار؟'' نور نے بھاگتے بھاگتے پوچھا۔

''دھرم شالہ میں۔'' قمرل نے جواب دیا۔

یہ دھرم شالہ نہ جانے کس زمانے میں تعمیر ہوئی تھی' اب تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اصل ں اس پہ سفید قلعی ہوئی تھی یا کوئی اور رنگ اس میں شامل تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ یہ عمارت نٹ اور چونے سے نہیں بلکہ لوہے کی زنگ آلود سیاہ چادروں سے کھڑی کی گئی ہے اس میں ارت تو ایسی زیادہ نہیں تھی۔ ایک طرف کو ایک لمبا سا برآمدہ شیطان کی آنت کی طرح کھنچا لا گیا تھا۔ برابر میں چند ایک کوٹھڑیاں۔ ہاں احاطہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ برگد اور پیپل کے گھنے سایہ دار درخت' دو تین آم جامن کے پیڑ' ایک ڈیڑھ نیم' بس یہی اس احاطے کی کل کائنات ھی۔ رہا وہ کنواں جو داخل ہوتے ہی بیس تیس قدم کے فاصلے پر نظر آتا تھا اور جس کی من عام کنوؤں کی من سے چوڑائی میں تقریباً دوگنی ہوگی۔ سو اس کا تو مدتوں سے پانی کا سوتا تک خشک ہو چکا تھا۔ بڑ کا جو درخت اس پہ سایہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے تنے کی رگیں کئی فٹ کے فاصلے تک پھیلتی چلی گئی تھیں اور اس کے موٹے گدوں سے سادھوؤں کی سفید سفید لمبی جٹائیں سی لٹکی ہوئی تھیں۔ یورش سب سے پہلے اسی درخت پر ہوئی۔ قمرل اور نور نے اس پر بے تحاشا اینٹیں برسائیں لیکن اس کے پتوں میں سے مور تو کجا چڑیا کا بچہ بھی برآمد نہ ہوا۔ شرافت اور اچھن نے بھی اینٹوں اور روڑوں کی مدد سے آس پاس کے کئی درختوں کا جائزہ لے ڈالا اور بالآخر سب کے سب تھک ہار کر کنوئیں کی من پہ آ بیٹھے۔

''یار حد ہوگئی۔'' قمرل بڑے مایوسانہ انداز میں بولا۔

نور آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ''سالے مور کے تو پر لگ گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی اڑن چھو ہو گیا۔''

شرافت کے چہرے پہ مایوسی کی قسم کی کوئی کیفیت نہیں تھی۔ اس نے اچانک اپنے نیفے پہ ہاتھ ڈالا اور ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو بے''

''امبیا'' سب کے سب بھونچکے رہ گئے۔

نور پوچھنے لگا۔ ''یہ کہاں سے آئی؟''

''ابے تم جیسا زٹیل تو نہیں ہوں کہ آواز سنتے ہی بھاگ چھٹتا۔ وہ چلایا اور میں نے کھٹ سے امبیا توڑ لی۔''

''حد ہوگئی یار'' قمرل کو ایک مرتبہ پھر اپنا فقرہ دہرانے کی ضرورت پیش آئی۔

شرافت نے بڑی بے تکلفی سے امبیا پر دانت مارا۔ سب کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ لیکن شرافت سخاوت پر مطلقاً آمادہ نہیں تھا کھاتے کھاتے اس نے اچھن کو مخاطب کیا۔

''اچھن امبیا لے گا''

''ہاں۔'' اچھن کے منہ میں اور پانی بھر آیا۔

شرافت نے امبیا اس کی طرف بڑھادی لیکن جب اچھن نے امبیا لے لی تو شرافت بولا۔

''پر ایک شرط ہے۔''

''کیا؟''

''یاں آ کان میں بتاؤں گا۔''

اچھن اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ شرافت نے پہلے نور کو نگاہ بھر کے دیکھا' پھر وہ اپنے ہونٹ اچھن کے کان کے قریب لے گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور ایک نیم تاریک' نیم روشن رو اس کے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ اس کا شعور' اس کے ہوش و حواس' اس رو میں تحلیل ہونے لگے۔ پھر اس کا پورا جسم ایک نیم تاریک نیم روشن گرم رو بن گیا۔ اس کے ہونٹ خود بخود سرخ و سفید نرم رخسار کے سامنے آ گئے۔ اچھن کے کان کی لویں گرم ہو کر کانپنے لگیں اور وہ گرم شہد آگیں کیفیت جو اچھن کے رخسار پر پیدا ہوئی تھی شرافت کے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آنکھیں بند کر لے اور اس کیفیت میں ڈوبتا چلا جائے لیکن دوسرے ہی لمحہ اچھن نے ہڑبڑا کر اسے دھکا دیا۔ شرافت ہٹ کر علیحدہ کھڑا ہو گیا۔

سرخی اچھن کے کانوں کی لووں سے چل کر پورے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں

ں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ شرافت الگ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں میں شہد سا گل رہا تھا' اس ے ہونٹوں میں' اس کے پورے جسم میں اور اس کا دل اندر سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اچھن ی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور ایک انجانے بے نام خوف کی مبہم کیفیت شرافت کے ر رینگ رہی تھی۔

نور کا خون اندر ہی اندر کھول کے رہ گیا۔ اس نے دانت بھینچے اور چاہا کہ آگے بڑھ ے ایک ایسا مکا شرافت کے منہ پر رسید کرے کہ اس کی بتیسی ٹوٹ جائے' مگر وہ جہاں کھڑا تھا ں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ شرافت' نور کیا ہر لڑکے کو پچھاڑ کے اپنی دھاک بٹھا چکا تھا۔ ایک تبہ پھر اس نے ہمت باندھی کہ شرافت کی کولھیا بھر کے زمین پر دے مارے لیکن جب اس نے شرافت پہ نظر ڈالی تو اس کے اطمینان کو دیکھ کر اس کا حوصلہ پھر جواب دے گیا۔ اس نے ر اچھن کو دیکھا۔ اس نے امبیا پھینک دی تھی۔ اپنے رخسار کو مل مل کر اس نے لال کر لیا تھا اور ی آنکھوں میں آنسو اسی طرح تیر رہے تھے۔ نور کے جسم میں پھر ایک چنگاری سی تیرتی چلی ئی۔ ایک تاریک غبار پیچ کھاتا ہوا حلق کی طرف اٹھنے لگا۔ اس نے اس غبار پر قابو پانے کی ری کوشش کی لیکن وہ سینے حلق اور دماغ میں بھر گیا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ گرم تاریک غبار۔ اس کے ہونٹ آہستہ سے کھلے۔ ''کمینہ ہے سالہ۔''

''کیا کہا؟'' شرافت لپک کر اس کے پاس جا پہنچا۔

نور کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے شرافت کو گھور کے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ خود بخود آہستہ سے پھر کھلے ''کمینہ۔''

شرافت نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ''کیا؟ کمینہ؟ پھر کہیو۔''

قمرل فوراً بیچ میں پڑ گیا۔ ''شرافت چھوڑ دے۔''

شرافت نے بغیر کسی اصرار کے گریبان چھوڑ دیا اور الگ ہٹتے ہوئے بولا۔ ''سالے گالی دی تو بکل اڑا دوں گا۔''

نور چپ چاپ اسے گھور گھور کے دیکھتا رہا۔ گرم تاریک غبار پیچ کھاتا ہوا بلند ہو رہا تھا' بیٹھ رہا تھا' بیٹھ رہا تھا' بلند ہو رہا تھا۔

قمرل شرافت سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے کہا نہیں تھا کہ سَے کے کانٹے سے لڑائی ہو

جاوے ہے؟''

شرافت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قمرل پھر بولا۔''شرافت' کانٹا پھینک دے۔''

''کیوں پھینک دوں۔'' شرافت غرایا۔

''پھینک دے۔ بہت منحوس ہووے ہے۔''

قمرل کی دلیلوں سے شرافت نے مطلق اثر قبل نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس سے زچ ہو گیا۔لیکن جب وہ اسے پھینکنے لگا تو قمرل نے اسے پھر روک دیا۔اس کی رائے تھی کہ اسے کہیں دور پھینکنا چاہیے۔شرافت من سے اٹھ کر دھرم شالہ کے دوسرے کونے کی طرف چلا۔تھوڑی دور جا کر وہ پکارا۔''قمرل یاں پھینک دوں''

''نہیں۔اور دور۔''

شرافت آٹھ دس قدم اور آگے بڑھ گیا۔''قمرل یاں پھینک دوں۔''

''پھینک دے۔''

شرافت نے کانٹا پھینک دیا۔اس کی نگاہ بھٹک کر سامنے پیپل کے درخت پر جا پڑی۔

پیپل کی جڑ میں ایک بڑا سا بندر دو ٹانگوں پر بیٹھا تھا۔شلغم کی گانٹھ جیسا سرخ منہ' سیاہی مائل بھورے بال۔اس نے شرافت کو گھور کے دیکھا' لیکن جسم کو کسی قسم کی حرکت نہیں دی۔شرافت چپکے چپکے پیچھے ہٹنے لگا۔

''ابے قمرل' بندر''

''کہاں؟''

''اس پیپل کے نیچے۔'' شرافت کی انگلی کے اشارے کے ساتھ قمرل اٹھ کھڑا ہوا۔

سب نے اینٹیں اٹھالیں۔ آگے آگے شرافت اور پیچھے قمرل' نور اور اچھن دھیرے دھیرے' دبے پاؤں' پیڑوں کی اوٹ میں ہوتے ہوئے' دبی آواز میں استفسار' سرگوشیوں میں ہدایتیں اور تنبیہیں۔ پیپل سے بیس' پچیس قدم کے فاصلے پر یہ سہا ہوا خطر پسند قافلہ رُک کر کھڑا ہو گیا۔قمرل نے استفسار آمیز انداز میں شرافت کی طرف دیکھا۔شرافت نے پیپل کی طرف دیکھا۔ پھر وہ پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔قمرل اور نور اور اچھن بھی ڈرتے

رتے آگے بڑھے۔ پیپل کے بالکل قریب پہنچ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر پوچھ گچھ کرنے لگے۔

قمرل نے دبی آواز میں پوچھا۔''کس جگہ بیٹھا تھا؟''

''یاں جڑ کے پاس۔''

نگاہیں پیپل کی جڑ پہ مرکوز ہو گئیں۔ پھر وہ اوپر اٹھیں اور پیپل کی چھدری شاخوں کا جائزہ لیا' پھر وہ منتشر ہو کر ادھر ادھر پھیل گئیں اور اطراف کو ٹٹولنا شروع کر دیا اور پھر وہ پلٹ کر آئیں اور ایک دوسرے کو تکنے لگیں اور رفتہ رفتہ قمرل کی آنکھوں میں وہی مانوس پر اسرار کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔

''سے کا کانٹا کہاں پھینکا تھا؟'' قمرل نے سرگوشی کے انداز میں سوال کیا۔

''یہیں پیپل کے پاس۔''

قمرل کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی نگاہوں میں وہ پر اسرار کیفیت گہری ہوتی گئی۔نور' اچھن' شرافت سب کی نگاہیں قمرل پہ جمی ہوئی تھیں۔

''وہ بندر نہیں تھا'' قمرل کی آواز خاموشی اور تکلم کی پر اسرار نیم تاریک سرحد پر بھٹک کر گم ہو گئی۔

اس کے بھید بھرے لفظوں نے منتر کا کام کیا۔ دھرم شالہ کی زمین جادو کا دیس بن گئی۔ پیڑوں کی اوٹ میں ان گنت سائے چپکے چپکے چل رہے تھے۔ بوڑھے برگد کے پتوں کے نیم تاریک گوشوں میں ڈراؤنی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ نگاہیں آپس میں ملیں جسموں کے سارے حصے ساکت تھے' معطل تھے' بس پتلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور دلوں کی دھک دھک خاموشی کے طلسم سے لڑ رہی تھی۔ پیپل کے پتوں میں حرکت ہوئی۔

''بھاگو۔'' یہ قمرل کی آواز تھی اور قمرل اور نور اور اچھن بھاگ کھڑے ہوئے۔

''ڈرپوک سالے'' شرافت حقارت آمیز انداز میں بڑبڑایا اور پلٹنے کی نیت سے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اچھن کا مور کا پر گر پڑا تھا۔شرافت نے بڑھ کر اٹھا لیا اور اسے فضا میں بلند کر کے گھمانے لگا۔ اسے اچھن یاد آ گیا۔اس کا نرم رسیلا گال اور اس کے ہونٹوں میں پھر شہد گھلنے لگا۔ اس نے مور کا پر اپنے منہ کے آگے کر لیا۔ نیلے ریشوں میں گھری ہوئی سنہری چمکیلی

ٹکلی اس کے ہونٹوں پر آن لگی۔ گرم رسیلے ملس کی کیفیت ہلکے ہلکے پھر ابھرنے لگی۔ ایک نیم تاریک نیم روشن رو اس کے جسم میں پھر کروٹیں لے رہی تھی اور یہ رو اس کے شعور پر یوں چھاتی چلی گئی جیسے ساون کے مہینے میں کبھی کبھی کالی گھٹا ایک ساتھ اندھیری دے کے اٹھتی ہے اور دیکھتے دیکھتے آسمان پر چھا جاتی ہے۔ وہ ایک سنسان جنگل میں جانکلا۔ جہاں برگد نیم اور پیپل کے اونچے گھنے درخت کھڑے تھے اور ان کے سایوں نے زمین پر اندھیرا کر رکھا تھا۔ ایک برگد کے نیچے نیم تاریک نیم روشن فضا میں ایک بڑا سا بندر کھڑا تھا' منہ سرخ انگارہ' بل کھاتی ہوئی کھڑی دم' سیاہی مائل بھورے بال...... پیپل کے پتوں میں ایک دھیما شور ہوا۔ وہ چونک اٹھا۔ اندھیری گھٹا جس تیزی سے گھر کر آئی تھی اسی تیزی سے چھنٹ گئی۔ اس نے آہستہ سے مڑ کر دیکھا۔ ایک بندر درخت سے نیچے اتر رہا تھا۔ بندر گدے سے تنے پر آیا اور تنے سے نیچے اتر کر آہستہ سے ایک طرف کو ہولیا۔ شرافت نے منہ موڑ لیا اور پھر اپنی اسی رفتار سے چلنے لگا۔ چلتے چلتے اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے اس کے قدم بھی تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے پورے جسم کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور تیز اٹھتے ہوئے قدموں کو روک کر پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ چند قدم وہ اسی انداز سے چلا' مگر اس کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا اور اس کے قدم پھر تیز تیز اٹھنے لگے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مدافعت کی کوشش کی لیکن اس کی قوت مدافعت کمزور سے ارادے کی شکل میں ابھری اور عمل میں آئے بغیر ختم ہوگئی۔ اس کا دل اب زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹ کھلے اور اس نے قل پڑھنی شروع کر دی۔ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شاید کوئی دبے پاؤں اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ پھر یہ آہٹ قریب ہوگئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن پھر فوراً ہی اس نے سوچا' مڑے اور مارے گئے۔ اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور قل کو چھوڑ کر نادعلی دل ہی دل میں زور زور سے اور جلدی جلدی پڑھنی شروع کر دی۔ اس نے مڑ کے پیچھے نہیں دیکھا تھا لیکن پھر بھی اسے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بندر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور کھنچتا چلا گیا' کھنچتا چلا گیا اور بلی بھر اونچا ہو گیا اور اب وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ قدم اور تیزی سے اٹھنے لگے' نادعلی کا ورد اور تیزی سے ہونے لگا اور اس کے اثر سے پیچھا کرتے ہوئے قدموں کی چاپ دھیمی پڑنے لگی وہ برگد

ے درخت کے نیچے ہوتا ہوا کنوئیں کی من کے پاس سے گزرا۔ جادو کے دیس کی سرحد قریب ی۔ اس نے قدم تیزی سے بڑھائے۔ اور دروازے پہ جا پہنچا۔ دروازے پہ پہنچ کر وہ ا یک مڑا۔ پیپل کے پیڑ کی سمت سے ایک سادھو برآمدے کی طرف جا رہا تھا۔ ہاتھ میں یتل کی لٹیا گلے میں مالا' جسم پر لمبا لمبا رونگٹا' بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھیں' سر پر لمبی لمبی بھوری ھوری جٹائیں جیسے بندر کے بال ہوں۔ شرافت بجلی کی تیزی سے اپنے پیروں کی طرف جھکا ور چپل ہاتھ میں لے پھرتی سے مڑا اور تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

مایا

کنکریا اینٹوں کی لمبی اونچی خستہ دیواریں‘ کاہی آلود ادھڑی ہوئی منڈیریں جن پہ جا بجا چیلوں کی بیٹیں لسی ہوئی تھیں‘ بیری کا پیڑ جو کسی زمانے میں ضرور ہرا بھرا ہوگا‘ لیکن اب اس کے خشک گھنے پتوں پہ روگ برس رہے تھے‘ اس پیڑ کے قریب باقی دوسرے کمروں کوٹھریوں سے الگ ایک کوٹھا کھڑا تھا جس کی آدھی چھت گر پڑی تھی اور آدھی چھت کا یہ حال تھا کہ چٹخی ہوئی خمیدہ کڑیوں پہ جھکی پڑتی تھی۔ اس میں پہلے کبھی تائی اماں رہا کرتی تھیں لیکن ان کے مرنے کے بعد اس میں تالا پڑ گیا اور اب تو اس تالے پر بھی زنگ لگ گیا تھا۔ یہ سب چیزیں روز کی دیکھی بھالی جانی پہچانی تھیں‘ لیکن آج ہر چیز کچھ اجنبی کچھ ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی انہیں ہلکے ہلکے زلزلے کا احساس ہوتا اور یوں لگتا کہ دیواریں اور منڈیریں اور چھتیں ہلتے ہلتے گر پڑیں گی اور صرف بیری کا پیڑ کھڑا رہ جائے گا۔ ایک عجب سا اضطراب‘ ایک دھیمے ذہنی آشوب کی کیفیت‘ کچھ پریشان‘ کچھ ڈری ہوئیں۔ کیا دیکھا تھا یہ تو یاد نہیں رہا تھا اب انہیں جو کچھ یاد تھا وہ ایک فوق الفطری فضا تھی‘ بدشگنی کی غماز‘ ابہام کی گرد میں لپٹی ہوئی۔ اس فضا سے متعلق ایک ہی چیز انہیں یاد رہ گئی تھی۔ ایک جھنکار۔ لیکن اس جھنکار کے متعلق بھی بس انہیں اتنا یاد تھا کہ وہ کوئی تند سی ڈراؤنی آواز تھی۔ لیکن کیسی‘ کس قسم کی‘ یہ انہیں اب یاد نہیں تھا۔ جس وقت ان کی آنکھ کھلی تھی تو یہ جھنکار ہی نہیں بلکہ پورا منظر واقعی سے زیادہ واقعی نظر آ رہا تھا۔ لیکن آنکھ کھلنے کے الفاظ شاید گمراہ کن ہیں۔ انہیں یہ پوری طرح احساس نہیں تھا کہ ان کی آنکھ کب کھلی اور کیسے کھلی۔ شاید انہوں نے جاگتے ہی میں سب کچھ دیکھا تھا لیکن تاریکی چھٹتی گئی اور منظر دھندلاتا گیا۔ ہاں ڈراؤنے پن کی کیفیت جوں کی توں رہی۔ رات ان کی چارپائی آدھی صحن میں اور آدھی دالان میں بچھی ہوئی تھی۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ شاید اسی کا اثر تھا۔

نہوں نے چارپائی گھسیٹ کر دالان میں ڈال دی۔ پھر بھی انہیں اطمینان نہیں ہوا۔ دل میں کبھی مبہم طور پر ہول سی اٹھتی اور کبھی دل ڈوبنے لگتا۔ بے قرار ہو ہو کر کئی مرتبہ وہ آنگن سے کمرے میں اور کمرے سے آنگن میں آئیں۔ بیری کا پیڑ‘ ٹوٹا ہوا کوٹھا‘ ادھڑی ہوئی منڈیریں‘ کچے فرش کا آنگن‘ ہر چیز کچھ نامانوس نظر آ رہی تھی۔ اسی گلی میں مولوی صاحب رہتے تھے۔ جو معمولی روحانی روگوں کا چٹ پٹ سے علاج کر دیا کرتے تھے۔ سلیمہ آپا ان کے پاس بھی گئیں لیکن مولوی صاحب کیا کرتے۔ سلیمہ آپا خواب بیان کر دیتیں تو وہ تعبیر دیتے اور سلیمہ آپا کو پورا خواب تو کیا کوئی ایک تفصیل بھی یاد نہ تھی۔ بس وہ اپنی بے قراری سے یہ ثابت کر سکتی تھیں کہ خواب جو کچھ بھی ہو‘ تھا بہت پریشان۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ”ذہن میں پریشان خیالات تھے‘ وہی خواب میں نظر آ گئے۔ ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد سو مرتبہ قل پڑھ لیا کرو۔ انشاء اللہ پھر کوئی پریشان خواب دکھائی نہیں دے گا۔“

سلیمہ آپا نے مولوی صاحب کی بات گانٹھ میں باندھ لی‘ پہلے تو گنڈے دار نماز پڑھا کرتی تھیں۔ پاک کپڑے ہوئے نماز پڑھ لی‘ پاک نہ ہوئے نہ پڑھی‘ نماز ہو گئی تو فبہا نہ ہوئی تو کوئی غم نہیں۔ لیکن اب وہ نماز کی ایسی پابند ہوئی تھیں کہ چاہے کچھ ہی ہو جاتا نماز قضا نہ ہوتی۔ ذرا کپڑوں پہ چھینٹ آ جاتی تو دن بھر انہیں دھوتیں‘ پاک کرتیں‘ سکھاتیں۔ ظہر‘ عصر کی نماز بھلے ہی قضا ہو جاتی۔ مگر مغرب کی نماز ہر حالت ہر صورت میں پڑھتیں۔ نماز کے بعد گھنٹوں جانماز پہ بیٹھی رہتیں اور تسبیح پہ قل پڑھا کرتیں۔ قل پڑھنے کا واقعی اثر ہوا۔ اس کے بعد انہیں کوئی پریشان خواب نظر نہیں آیا۔ در و دیوار کی نامانوسیت ختم ہو گئی۔ چیزیں پھر اپنی اسی جانی پہچانی شکل میں نظر آنے لگیں۔ طاہر پاس ہوا تو انہوں نے محلے میں جلیبیاں بانٹیں اور سارے دن دعائیں مانگیں کہ الٰہی آلِ محمدؐ کے صدقے میں میرے طاہر کو حکومت کی نوکری ملے۔ اس کے گھر لکھ لٹیں اور دولت سر آوے پیر جاوے۔“

طاہر پاس ہو گیا تھا لیکن ملازمت اسے ابھی کہیں نہیں ملی تھی۔ طاہر کی بیکاری کے ساتھ ساتھ سلیمہ آپا کی مغرب کی نماز طویل ہوتی گئی اور قل کا ورد بڑھتا گیا۔ کبھی کبھی وہ رات گئے تک جانماز پہ بیٹھتی رہتیں اور یہ انتظار رہتا کہ کسی نیک گھڑی میں انہیں طاہر کی نوکری کی بشارت ملے گی۔ انہیں اس قسم کی کوئی بشارت تو نہ ملی۔ جو ہوا اسے انہوں نے بشارت کی

بجائے بدشگنی سمجھا۔ دوسرے دن بکرا ذبح کیا گیا اور اس کا گوشت غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم ہوا۔ مولوی صاحب سے بڑی عجلت میں تعویذ لکھوایا گیا۔ سلیمہ آپا نے فوراً تعویذ سیا اور طاہر کے بازو میں باندھ دیا۔ چند دن تک انہیں طاہر کی طرف سے سخت فکر رہی اور ذرا ذرا سی بات پر شک کیا لیکن رفتہ رفتہ تعویذ اور صدقے نے اپنا اثر دکھایا۔ سلیمہ آپا پھر مطمئن ہو گئیں اور پھر طاہر کی جان سے زیادہ طاہر کی نوکری کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ سلیمہ آپا کو بڑی حسرت تھی کہ ان کے طاہر کو کوئی اعلیٰ عہدہ ملے اور کیوں حسرت نہ ہوتی ان کے ایک ہی بیٹا تھا۔ انہوں نے فاقے کر کر کے اسے پڑھایا تھا۔ بے باپ کے بچے اکثر بگڑ بھی جایا کرتے ہیں لیکن سلیمہ آپا نے طاہر کی ایسی تربیت کی کہ کیا کوئی کرے گا۔ انہیں کئی یتیم بچوں کی مثالیں ازبر تھیں جنہوں نے گلی کی لالٹینوں کے نیچے کھڑے ہو ہو کے کتابیں ختم کیں اور اول درجے میں امتحان پاس کر کر کے جج اور ڈپٹی کلکٹر بنے۔ ان مثالوں کو انہوں نے ان گنت مرتبہ طاہر کے سامنے دہرایا ہوگا۔ ان کی نصیحت نے واقعی اثر کیا اور طاہر امتحان میں اول آیا۔ اب یہ قسمت کی بات تھی کہ اسے ابھی تک نوکری نہیں ملی تھی۔ وہ کبھی کبھی بڑی حسرت سے کہتی تھیں کہ اس کا کارخانہ نرالا ہے بعض کو تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے اور بعضوں کی تو کل ایسی بگڑتی ہے کہ سنورنے کا نام نہیں لیتی۔'' پھر بھی انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز ان کی کل ضرور سنورے گی۔ اسی توقع میں انہوں نے عمّا یجیب المضطر کا وظیفہ بھی پڑھا اور چالیس دن کا چلہ کھینچا۔

وظیفہ پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں ہوتا کہ ان کا ذہن بھٹک کر کہیں سے کہیں جا پہنچتا لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ ہڑبڑا کر اپنی توجہ پھر وظیفے پر مرکوز کر دیتیں۔ سلیمہ آپا کو خوب علم تھا کہ وظیفے کی تکمیل اور کامیابی کا تعلق یکسوئی سے ہے انہوں نے زیادہ احتیاط برتنی شروع کی اور ذہن کو تسبیح کے دانوں پہ مرکوز رکھنے کے لیے بیسیوں طریقے استعمال کیے' مگر کم بخت ذہن بھٹکنے پہ آتا ہے تو اشارہ پائے بغیر بھی بہک جاتا ہے اور اس آہستگی سے بہکتا ہے کہ آہٹ تک نہیں ہوتی۔ چالیسویں دن وہ پھر بھٹکا اور نہ جانے کون سی وادی میں جا نکلا۔

''اری بیٹا کیا بتاؤں کیسی آواز آتی تھی۔ چھن چھن چھن۔ دولت لے لے' بیٹا دے دے' دولت لے لے' بیٹا دے دے۔ دیگ آنگن کے نیچے کھنکتی ہوئی کبھی اس کونے سے اس کونے تک آتی۔ کبھی اس کونے سے اس کونے تک جاتی۔ ایک دن سنا' دو دن سنا۔ کم بخت

ری کی آخر نیت بگڑ گئی۔ دیگ نکال لی۔ اشرفیوں سے لبالب بھری ہوئی دیگ...... اے بی بی یگ کا نکالنا غضب ہو گیا۔ ایک بیٹا گیا' دوسرا بیٹا گیا' تیسرا بیٹا گیا۔ ہری ہری تے آئی اور تم۔ بدنصیب کے تینوں پوت دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو گئے۔''

تائی اماں چپ ہو گئیں۔ ان کے چہرے پہ خوف کی ایک ہلکی پرچھائیں کانپنے لگی تھی۔ نہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''بس اس کے غضب سے ڈرتا ہی رہے۔ برا وقت آتے دیر نہیں لگتی''۔ اور پھر خاموش ہو گئیں۔

سلیمہ کی آنکھوں میں دہشت کی کیفیت تیر رہی تھی۔ وہ تائی اماں کے چہرے کو تکتی رہی' پھر بولی۔ ''تائی اماں' یہ دولت کہاں سے آوے ہے۔''

تائی اماں نے پٹاری کھول کے ذرا سا زرد تمباکو ہتھیلی پہ رکھا اور اسے چٹکی سے ڈاڑھ یں رکھتے ہوئے بولیں۔ ''اری بیٹی یہ کم بخت مارے بے اولادے اپنی دولت زمین میں گاڑ یوے ہیں۔ ان کی دولت کسی کو راس نہیں آتی۔'' تائی اماں چپ ہوئیں' پھر بولیں۔ ''بی بی' ہمارے گھر کے برابر ایک بنیا رہتا تھا۔ کم بخت کے اولاد نہیں تھی۔ اس نے کیا کیا کہ اپنی ساری جمع جتھا کوٹھڑی میں داب دی اور اس پہ سانپ کے دو پتلے بنا کے بٹھا دیئے۔ وہ جب مرا تو اے بی بی وہ سچ مچ کے سانپ بن گئے۔ یہ کالے کالے لمبے لمبے سانپ۔ کوٹھڑی میں کسی نے قدم رکھا اور وہ پھن اٹھا کے کھڑے ہو جاویں تھے۔''

سلیمہ کی آنکھوں میں حیرت اور ہراس کی کیفیت اور گہری ہو گئی۔ اسے ایک جھرجھری آئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے تائی اماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تائی اماں' یہ دولت منحوس ہووے ہے؟''

''اے اور کیا منحوس تو ہووے ہی ہے۔ جس کے گھر آ گئی اس کا گھر اوجڑ ہو گیا...... اللہ ہر بلا سے بچا تا رکھے۔'' تائی اماں کے چہرے پہ پھر وہ کیفیت پیدا ہو گئی گویا وہ کسی خوف ناک راز کا انکشاف کرنے والی ہیں۔ ''غدر کے بعد ایسی جوان جوان موتیں ہوئی ہیں۔ ہوا کیا کہ غدر میں سیٹھوں' ساہوکاروں نے اپنا روپیہ زمین میں گاڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ لے بی بی وہ دولت تو سرک گئی اور کہیں کی کہیں پہنچی۔ اس زمانے میں راتوں کو اشرفیوں کی دیگیں کھنکنے کی آوازیں آتی تھیں۔''

تائی اماں چپ ہوگئیں اور سلیمہ انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگی۔ تائی اماں نے پاندان کھولا۔ پان لگاتے لگاتے کہنے لگیں۔ ''اری سلیمہ بیٹا میری پٹاری میلی ہو رہی ہے۔ کل اسے مانجھ ڈالیو۔'' انہوں نے گلوری منہ میں رکھی اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگیں۔ ''ارے بی بی سب قسمت کی بات ہے بعضوں کو تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ دولت بھینٹ لیوے ہے' مگر خان صاحب والوں کو تو کچھ بھی نہ ہوا۔''

سلیمہ تعجب سے پوچھنے لگی۔ تائی اماں خاں صاب کو دولت ملی تھی۔''

''اے اور کیا'' تائی اماں ذرا گرما کر بولیں۔'' پہلے تو مٹوں کے گھر خاک اڑتی تھی۔ قسمت کی بات ہے' گھر کی ایک دیوار برسات میں ڈھے گئی' واں چھناکا ہوا۔ انہوں نے راتوں رات دیوار کی نیم کھودی اور ساری دولت نکال لی۔''

''اچھا؟'' سلیمہ حیرت سے تائی اماں کو دیکھنے لگی۔

تائی اماں نے پان کی پیک چارپائی کے پیچھے دیوار پہ تھوکی اور سلیمہ کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹھنڈا سانس لیا اور کہنے لگیں۔'' ہاں اپنا اپنا نصیب ہے' اپنا اپنا لہنا ہے' ہمارا جب یہ گھر بن رہا تھا تو اس کوٹھے کی جب نیم کھد رہی تھی تو ایک ساتھ چھناکا ہوا۔ ابا جی نے جلدی جلدی زمین کھدوائی دیگ تو نکل پائی مگر اس میں چونا بھرا ہوا تھا۔''

سلیمہ بھوچکی رہ گئی۔ ''اشرفیں کہاں گئیں؟''

''اجی بس تقدیر میں نہ تھا'' تائی اماں متاسفانہ لہجے میں بولیں۔

تائی اماں کے کوٹھے نے یکا یک ایک پراسرار حیثیت اختیار کر لی۔

سلیمہ کوٹھے کی دیواروں کو تکنے لگی' پھر بولی۔ ''تائی اماں اب بھی وہ دولت یہاں ہو گی؟''

''ہائے کیا خبر ہے بیٹی' سرک گئی ہو؟''

سلیمہ آپا کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر جانماز پر گر پڑی۔ وہ ہڑبڑا گئیں اور گھبرا کے تسبیح اٹھائی۔ کتنے دانے باقی رہ گئے تھے۔ یہ انہیں بالکل یاد نہیں تھا۔ انہوں نے گھبراہٹ میں پہلے دانے سے شروع کیا اور پوری تسبیح ختم کر ڈالی۔ یہ آخری تسبیح وہ پڑھ رہی تھیں ان کا وظیفہ تو ختم ہو گیا لیکن انہیں اطمینان نہ ہوا کہ وظیفہ واقعی پورا ہو گیا ہے۔ رات بھر انہیں وسوسے اور شک

ستاتے رہے۔ رہ رہ کے انہیں اپنی بھول کا خیال آتا اور پھر تسبیح کا گرنا۔ اس سے بڑی بدشگنی ور کیا ہو سکتی تھی۔ صبح گجروم وہ پھر مولوی صاحب کے پاس پہنچیں اور وظیفے کی واردات کہہ سنائی۔

مولوی صاحب بولے۔ ''بی بی فکر کی بات نہیں ہے۔ جلالی وظیفہ اگر بگڑ جائے تو پھر تو جان تک پہ نوبت آ جاتی ہے اور دیوانے ہوتے تو ہم نے اکثر دیکھے ہیں۔ حافظ جی تھے نہیں' خدا انہیں غریق رحمت کرے' ان کا جلالی وظیفہ بگڑ گیا۔ چالیسویں دن حصار کھینچنا بھول گئے۔ آخری دانے پہ پہنچے تو لگا کہ ہاتھ میں تسبیح نہیں سانپ ہے اور جیسے یہ سانپ منہ میں جا رہا ہے۔ فوراً ہاتھ منہ کی طرف اُٹھ گیا۔ تسبیح ہاتھ سے گر پڑی۔ ساری نفس کشی پہ پانی پھر گیا۔ ہر وقت ہاتھ منہ پہ رہتا تھا۔ جیسے کوئی چیز منہ سے کھینچ رہے ہیں۔ رات بھر چلاتے تھے' اسی میں مر گئے۔ خیر مٹی عزیز ہو گئی۔ خدا جنت نصیب کرے۔'' مولوی صاحب ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو گئے۔ اک ذرا توقف سے پھر بولے'' مگر بی بی تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تمہارا وظیفہ جلالی تھوڑا ہی تھا۔''

سلیمہ آپا بولیں۔ ''اجی مولوی صاحب مجھے شک آوے ہے۔''

''شک دل سے نکال دو'' مولوی صاحب بولے۔ ''شیطان تمہارے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ بس یہ کرو کہ قل کا ورد رکھو۔ جتنا پڑھو گی اتنا ہی فائدہ ہو گا۔''

سلیمہ آپا نے قل کا ورد ایسا شروع کیا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئیں۔ مغرب کی اذان کے وقت جانماز پہ بیٹھتیں اور رات گئے تک جانماز پہ بیٹھی رہتیں۔ صبح کی اذان پہ پھر اٹھ بیٹھتیں اور دن چڑھے تک تسبیح پڑھتی رہتیں۔ تسبیح یکسوئی سے پڑھتیں۔ لیکن بندہ بشر ہے دل میں اچھا برا ہر طرح کا خیال آتا ہے تسبیح پھیرتے پھیرتے ذہن بھٹک جاتا اور نیم تاریک دھندلے رستوں پہ پڑ لیتا اور طرح طرح کے مناظر دیکھتا چلا جاتا۔ کبھی سارے کمرے اور کوٹھے گرے نظر آتے اور اس ملبے میں اکیلا بیری کا پیڑ سلامت کھڑا دکھائی دیتا۔ کبھی کمروں اور کوٹھوں کی صرف چھتیں غائب ہو جاتیں اور دیواریں شکستگی کے عالم میں چپ چاپ کھڑی رہتیں۔ بیری کا پیڑ کبھی لنڈ منڈ کھڑا ہوتا اور کبھی ہرے ہرے پتوں اور زرد و سرخ بیروں سے لدا ہوتا اور اس کی جڑ میں کالے سانپوں کا جوڑا پھن اٹھا کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر ان سانپوں کا دم

کھنچتا چلا جاتا اور آٹے کے دو سانپ پڑے دکھائی دیتے۔ پھر یہ سانپ اور بیری کا درخت اور بے چھتوں والی دیواریں سب غائب ہو جاتیں اور وہاں ایک حویلی کھڑی ہوتی۔ حویلی میں بیاہ کا دھوم دھڑکا برپا ہوتا۔ بیبیوں کا ہجوم' ڈومنیوں کے گیت' تھالی میں سلامی کے روپیوں کی ڈھیری' طاہر کے سہرا بندھنے لگتا۔ طاہر کے سہرا بندھتے بندھتے نہ معلوم کیا ہوتا کہ رخصتی ہونے لگتی۔ حویلی میں سے ڈولا نکلتا اور ڈولے میں دلہن کا سرخ جوڑا پہنے ہوئے وہ خود ہوتیں۔ سلیمہ آپا ایکا ایکی چونک پڑتیں اور پھر تیزی سے تسبیح پھیرنے لگتیں۔

قل کا ورد بڑھتا گیا لیکن پراگندہ خاطری کم نہ ہونی تھی' نہ ہوئی۔ سلیمہ آپا خفقانی سی رہنے لگیں۔ دیواریں اور چھتیں کاٹنے کو دوڑتیں۔ گھر کے ہر کونے میں ایک بھید کی کیفیت نظر آتی۔ ان کا دم گھٹنے لگتا۔ کبھی ان پہ ایک اور کیفیت طاری ہوتی۔ انہیں یوں لگتا کہ وہ گھر کو چھوڑ چھاڑ کر کسی ویرانے میں نکل گئی ہیں۔ قل کا ورد اور بڑھا اور کبھی کبھی یوں ہوا کہ مغرب کی نماز کے ڈانڈے صبح کی نماز سے جا ملے۔ طاہر نے کئی مرتبہ انہیں ٹوکا بھی' لیکن سلیمہ آپا اپنی دھن میں تھیں' کب کسی کی سنتی تھیں۔ جانماز پہ بیٹھے بیٹھے جو ان پہ کیفیت گزرتی تھی وہ تو خیر تھی ہی عجیب سی لیکن اب جانماز سے اٹھنے کے بعد بھی ان پہ دوسرا عالم گزرنے لگا۔ پہلے ایک دو مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ جانماز لپیٹ کر اٹھیں' جوتیاں پیروں میں ڈالیں' قدموں کی آہٹ کے ساتھ چھن سے آواز ہوئی۔ سلیمہ آپا نے ادھر دیکھا ادھر دیکھا' کچھ بھی نہ تھا۔ صحن میں چلتے چلتے زور سے ان کا پیر پڑتا اور ایکا ایکی دھیما سا چھناکا ہوتا اور معدوم ہو جاتا۔ بیری کے نیچے سے گزرتے ہوئے تو اکثر یہ واردات گزرتی رفع حاجت کے لیے اسی درخت کے نیچے سے نکلنا پڑتا تھا۔ صبح کی نماز کے وقت جب وہ لوٹا لے کر درخت کے نیچے سے نکلتیں تو اچانک ایسا لگتا کہ زمین کی تہہ میں کہیں بہت نیچے بہت سی اشرفیاں کھنکتی ہیں۔ پہلے تو انہیں اس بات پہ بہت شک آیا اور نہ جانے کیسی بدشگنی کی باتیں ان کے ذہن میں آئیں۔ ان کے جی میں آئی کہ مولوی صاحب سے جا کر ساری بات کہہ سنائیں اور طاہر کے لیے نیا تعویذ لے آئیں۔ لیکن پھر کچھ سوچ ساچ کر انہوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ہاں اپنی طرف سے انہوں نے بہت احتیاط برتی۔ آنگن میں ہولے ہولے چلتیں اور بیری کے نیچے سے نکلتے ہوئے تو ان کے قدم اتنے دھیرے اٹھتے جیسے وہ بتاشوں پر چل رہی ہیں کبھی کوئی تیز قدم اٹھ جاتا تو چونک پڑتیں

اور کان کھڑے ہو جاتے کہ اب چھناکا ہوا اور اب چھناکا ہوا۔ دن گزرتے گئے اور وہ اس آواز سے مانوس ہوتی گئیں۔ چھناکے کے ساتھ ساتھ ان کا دل دھڑکنے لگتا۔ لیکن پھر طرح طرح کی خواہشیں بھی کروٹ لینے لگتیں۔ انہیں ان دنوں خاں صاحب والوں کا بھی رہ رہ کر خیال آیا۔ خاں صاحب والوں کی سرسبزی اور خوشحالی اس بات کی دلیل تو ضرور تھی کہ زمین سے نکلا ہوا خزانہ ہمیشہ بربادی کا سامان پیدا نہیں کرتا۔ یہ تو اس شخص کی عادت و خصلت پر منحصر ہوتا ہے، جس نے اپنا پیسہ دفن کیا ہے۔ اگر کوئی کمبخت شیطان ہے تو اس کی دولت بھی کم بخت ہو گی۔ اگر کوئی نیک بخت ہے تو اس کی دولت سے کیا جوکھوں۔ اور منحوس دولت کے چھناکے کے ساتھ تو آواز بھی آتی ہے۔ مایا لے لئے بٹیا دے دے۔ مگر یہاں تو صرف چھناکا سا پیدا ہوتا ہے' آواز تو کبھی کوئی سنائی نہیں دی۔ آخر سلیمہ آپا نے فیصلہ کر ہی لیا کہ زمین کھودنی چاہیے۔ منحوس دولت ہوئی تو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ مگر دیکھوں تو سہی کہ کیا ہے' کیسی ہے۔ انہوں نے پڑوس والی کمہارن سے کہلا بھیجا کہ ''ذرا بی بی پھاوڑا دے جا۔ تندور کھودنا ہے'' کمہارن پھاوڑا لے کے آئی تو سلیمہ آپا نے کہہ دیا کہ ''اری اسے بیری کے نیچے رکھ دے۔''

کمہارن پھاوڑا لے کے بیری کے تلے بیٹھ گئی۔ ''آپا جی! لاؤ میں کھود دوں۔''

سلیمہ آپا گھبرا گئیں۔ فوراً جا کے ہاتھ سے پھاوڑا لے لیا۔ ''نا بی بی تو جا' میں خود کھود لوں گی''

کمہارن چلی گئی اور سلیمہ آپا نے پھاوڑا وہیں رکھ دیا۔ کئی دن تک وہ پھاوڑا یونہی رکھا رہا۔ سلیمہ آپا بار بار ارادہ کرتی تھیں کہ زمین کھودیں مگر پھر ان کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس دن نہ جانے کیا ہوا۔ شاید تائی اماں والے ٹوٹے کوٹھے میں کھٹکا ہوا تھا۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ سلیمہ آپا تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ جانماز تہہ کی اور لالٹین اٹھا کر کوٹھے کے پاس جا پہنچیں۔ اس کوٹھے میں ویسے تو تالا پڑا ہوا تھا' ہاں جنگلے سے سارا اندر نظر آتا تھا۔ لالٹین اٹھا کر کوٹھے میں جھانکنے لگیں۔ کوٹھے میں مٹی کوڑے کے اونچے نیچے ڈھیر اسی پرانے انداز سے پڑے تھے ہر طرف خاموشی تھی۔ ہاں ایک کونے میں ایک بدرنگ کالی بلی اپنے دو بچوں کو لیے پسری ہوئی تھی۔ اپنے چمکتے ہوئے گول گول دیدوں سے وہ سلیمہ آپا کو گھورنے لگی۔ ان کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ انہوں نے سہم کر لالٹین نیچی کر لی اور وہاں سے ہٹ گئیں۔ مگر ایکا ایکی انہیں

ایسا لگا کہ اشرفیوں سے بھری ہوئی کوئی دیگ کھنکتی ہوئی زمین کے اندر ہی اندر کوٹھے کی طرف سے چلی اور بیری کے نیچے جا کر ٹھہر گئی۔ ان پر کسی نے جیسے جادو کر دیا' قدم بے ساختہ بیری کی طرف اٹھ گئے۔

انہوں نے پھاوڑا اٹھایا اور واقعی زمین کھودنی شروع کر دی۔ لیکن پہلے ہی وار میں ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ آنگن اگرچہ کچا تھا لیکن بیری کے نیچے والی زمین ذرا پتھریلی ہو گئی تھی۔ پھاوڑا جھن سے اینٹ سے ٹکرایا اور سلیمہ آپا کا دل دہل گیا۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پھاوڑا انہوں نے ہاتھ سے رکھ دیا۔ ان کی پیشانی پہ پسینہ آ گیا تھا۔ آنچل سے انہوں نے پسینہ پونچھا' دل کو ذرا سنبھالا اور ہمت کر کے پھر پھاوڑا اٹھایا۔ پھاوڑا اٹھاتے اٹھاتے وہ پھر چونک پڑیں۔ انہوں نے ڈر کر اوپر دیکھا مگر اوپر تو کچھ بھی نہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل پڑی تھی اور اس کے اثر سے بیری کے پتوں میں دھیما سا شور پیدا ہو گیا تھا۔ یہ شور سرگوشیوں کی کیفیت سے گزر کر آہستہ آہستہ چھناکا اشرفیوں کا بن گیا۔ انہوں نے پھاوڑا اٹھایا۔ پھاوڑا پھر اینٹ سے ٹکرایا۔ جھن جھن جھن۔ مایا لے لے...... مایا لے لے...... اشرفیوں سے بھری ہوئی دیگ زمین کے بہت نیچے کہیں کھنک رہی تھی اور ایک تند اور ڈراؤنے شور کے ساتھ تیزی سے اوپر اٹھتی چلی آ رہی تھی۔ جھن جھن جھن جھن۔ مایا لے لے...... مایا لے لے...... آواز ان دو لفظوں پر ختم نہیں ہوتی تھی۔ الفاظ آگے اور بھی تھے اور شاید وہ زیادہ ڈراؤنے تھے لیکن بار بار وہ اشرفیوں کی جھنکار میں گم ہو جاتے تھے۔ مگر پھر ایک ساتھ آواز صاف سنائی دینے لگی۔ جھن جھن جھن۔ مایا لے لے بیٹا دے دے مایا لے لے بیٹا...... سلیمہ آپا کے ہاتھ سے پھاوڑا گر پڑا۔ ان کا دل ہل گیا۔ جسم یوں کانپا جیسے زلزلے میں عمارتیں ہلنے لگتی ہیں۔

تین دن تک برا عالم رہا۔ نیم غشی کی کیفیت دن رات طاری رہتی۔ جسم بار بار ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح ہلنے لگتا اور ایک ساتھ آنکھیں کھول دیتیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے طاہر کو دیکھتیں اور پھر انہیں اطمینان سا ہو جاتا۔ تیمارداری کرنے والا اور کون تھا۔ طاہر ہی دن رات سرہانے بیٹھا رہتا۔ بار بار نبض پہ ہاتھ رکھتا' دوا پلاتا' تیسری رات کو عجب واردات پیش آئی۔ طاہر دو راتوں کا جاگا ہوا تھا' غریب کی آنکھ لگ گئی' سلیمہ آپا سوتے سوتے ایک ساتھ چونک پڑیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ طاہر بے خبر سو رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے

اٹھیں' ہاتھ میں لالٹین لی اور اس احتیاط سے باہر چلیں جیسے زمین پہ بتاشے بچھے ہوئے ہیں۔ جھن جھن جھن۔ ایک بہت دھیمی مبہم آواز زمین کی کسی گہری تہہ سے آ رہی تھی۔ مگر کس طرف سے؟ بیری کے درخت کے نیچے سے؟ تائی اماں کے کوٹھے سے؟ نماز کی چوکی کے نیچے سے؟ وہ دھیرے دھیرے نماز کی چوکی کے پاس گئیں۔ اور جھک کر لالٹین سے اس کا ہر کونہ غور سے دیکھا۔ پھر تین مرتبہ قل پڑھ کے وہاں پھونکا اور آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کوٹھے کے جنگلے کے پاس وہ لالٹین لے کر کھڑی ہو گئیں اور اندر دیکھنے لگیں۔ بدرنگ کالی بلی اپنے بچوں کو لئے کوٹھے میں لیٹی تھی۔ گول گول لال انگارہ دیدوں سے اس نے انہیں گھور کے دیکھا۔ ان کا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے لالٹین نیچی کر لی' پھر آنکھیں بند کر کے قل پڑھنے لگیں۔ تین مرتبہ قل پڑھ کر انہوں نے وہاں پھونکا اور آہستہ سے آگے بڑھ گئیں۔ بیری کی طرف چلتے چلتے وہ رک گئیں۔ رکے ہوئے قدم آہستہ آہستہ پھر اٹھے مگر پھر رک گئے۔ انہوں نے بیری کی جڑ کی طرف غور سے دیکھا۔ غور سے دیکھے گئیں۔ ان پہ ہیبت چھا گئی۔ زمین پھٹ سی گئی تھی اور جیسے دیگ کا منہ اس میں سے ابھر رہا ہو۔ اشرفیوں سے بھری ہوئی دیگ' پاس ہی دو ناگ مرے پڑے تھے۔ بس انہیں ایسا ہی دکھائی دیا۔ سلیمہ آپا گھگھیا کر وہاں سے بھاگیں۔ چیخ کی آواز سن کر طاہر کی آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر باہر آیا اور جلدی سے ماں کو تھاما۔ سلیمہ آپا بے ہوش ہو گئیں۔

سلیمہ آپا پہ رات بہت سخت گزری۔ رات بھر غشی میں رہیں اور رات بھر بڑبڑاتی رہیں۔ ادھ کٹے بے معنی' بے ربط فقرے' طاہر کو خیال ہوا کہ سرسام ہو گیا ہے۔ وہ رات اس نے سرہانے بیٹھے بیٹھے کاٹی۔ بار بار پیشانی پہ ہاتھ رکھتا۔ پیشانی بری طرح جل رہی تھی۔ سلیمہ آپا بار بار چونک کر آنکھیں کھولتیں اور غش ہو جاتیں۔ نیم تاریک رستے' گھنا جنگل' ویرانہ گری ہوئی چھتیں' شکستہ دیواریں' بیری کا اکیلا پیڑ' تائی اماں' ہری قے' بدرنگ کالی بلی کی انگارہ سی آنکھیں' آٹے کے سانپ کے ان گنت پتلے' پھنپھناتا ہوا ناگ' پھن' تسبیح' انگارہ سی آنکھیں' حافظ جی کا مسخ کھلا دہانہ۔ سلیمہ آپا رات میں جانے کتنی دفعہ گھگھیائیں' بار بار چونکیں' غشی سے نیم غشی کی حالت میں آئیں اور پھر غش ہو گئیں۔

سلیمہ آپا کے وظیفوں کے ساتھ ساتھ طاہر کی کوششیں بھی جاری تھیں اور ہر دفتر میں

درخواستیں بھیجی جارہی تھیں۔نوکری کا پروانہ کب آیا۔آج طاہر سارے دن ماں کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا۔بار بار پیشانی پہ ہاتھ رکھتا۔بخار تھا کہ چنے بھن رہے تھے۔نبض بے ربط اور دھیمی' اکھڑا اکھڑا سانس' ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ' سلیمہ آپا نے پھر آنکھ کھولی' بہت دھیرے سے۔اس وقت ان کی نظریں پھٹی پھٹی نہیں تھیں۔وحشت کی کوئی کیفیت نہیں تھی۔ان میں ایک نرم سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔طاہر سرہانے بیٹھا تھا۔اس نے سر جھکایا اور آہستہ سے رقت بھری آواز میں بولا۔''اماں جی مجھے نوکری مل گئی۔'' سلیمہ آپا طاہر کو دیکھتی رہیں' انھیں نرم سی کیفیت والی نگاہوں سے' پھر ان کی آنکھیں مندنے لگیں۔دھندلکا، نیم تاریک رستے' سائے اب اور گہرے ہوگئے تھے۔پگڈنڈیوں کی حدیں زیادہ دھندلی ہوگئی تھیں اور پھیلتی تاریکی میں گھل مل گئی تھیں۔حویلی میں بیاہ کا تاشہ بج رہا تھا۔سلیمہ آپا نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔کہاروں نے ڈولا اٹھایا اور باجے تاشے کے ساتھ ایک پراسرار نیم تاریک راہ پر چل پڑے۔دو کالے ناگوں نے اپنے پھنوں سے اس پہ سایہ کر رکھا تھا۔باراتی چھٹتے گئے' غائب ہوتے گئے' باجے تاشے کی آواز مدھم ہوتے ہوتے بالکل خاموش ہوگئی' اونچے اونچے گھنے درختوں کی دو رویہ قطار دور تک چلی گئی تھی۔گھنے درخت اونچے ہوتے ہوتے فضا میں کھو گئے تھے۔اور پگڈنڈی دھندلی ہوتی گئی' دھندلی ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ڈولا دھندلاتا گیا' دھندلاتا گیا۔پگڈنڈی اور ڈولا ایک دوسرے میں گھلنے لگے اور گھل کر ایک دھندلا سا دھبہ بن گئے۔یہ دھبہ سکڑتے ایک نقطہ بن گیا' ایک بہت دھندلا سا نقطہ۔

☆......☆......☆

کنکری

اس کی آنکھوں میں اب تک نیند کی ایک ہلکی ہلکی کیفیت تیر رہی تھی گرم بستر سے اٹھتے وقت اسے بڑی کوفت ہوئی تھی اور جاڑا بھی لگا تھا لیکن اب چہرے پر گرم گرم پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے ایک لذت محسوس ہو رہی تھی۔رات بستر میں لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور دن چڑھنے تک سوتا رہا تھا تھکن اتر چکی تھی مگر جسم میں ایک دھیما اضمحلال اب تک رینگ رہا تھا اور آنکھوں میں نشے کی سی ایک کیفیت' رات کا واقعہ اس کے ذہن سے اتر چکا تھا کچھ اسی طرح جس طرح وہ بعض دفعہ رات کا خواب صبح کو بھول جاتا تھا اور لے دے کے کوئی ایک ادھورا فقرہ' کوئی کٹا پھٹا دھندلا منظر یاد رہ جاتا تھا۔وہ بھی ایک خواب ہی تھا۔اندھیرے کھیتوں اور درختوں سے ہٹ کر آگ کا الاؤ' مولا کی کھچڑی بالوں والی داڑھی اور جھریوں سے بھرا ہوا متفکر چہرہ ......نشانہ چوک جاتا ہے......گولی کھلتی چلی جاتی ہے اور اس کے ساتھ شکاری...... ایک دھندلی تصویر' ایک دھندلی گونج' اس نے سوچا کہ لوگوں نے بھی کیا کیا فسانے تراشے ہیں اور اس خیال کے ساتھ ساری بات' رفع دفع ہوگئی۔منہ ہاتھ دھو کر اس نے تولیہ اٹھایا اور جب وہ منہ پونچھ کے اور بالوں میں بے پرواہی سے کنگھا کر کے ناشتے کی میز پر آکے بیٹھا تو وہ اپنے آپ کو پھول سا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔نیند کا وہ ہلکا نشہ تولیے کے لمس کے ساتھ ہی غائب سا ہو گیا تھا۔

اماں جی نے آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا''کم بخت یہ شکار کا جن اچھا سوار ہوا ہے سارے کام چٹ ہو گئے۔دن' رات شکار'' اماں جی چپ ہوگئیں وہ خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کرتا رہا۔

اماں جی دم لے کر پھر بولیں ''رات دن مارا مارا پھرے ہے۔ کھانے کا ہوش' نہ پینے کی خبر۔ دیکھو تو سہی کتنا سامنہ نکل آیا ہے''

''کیا؟'' وہ چونک پڑا۔ ایک ساتھ اس کی نظر اماں جی کی طرف اٹھ گئی مگر اماں جی رد عمل سے بے خبر اپنی ہانکے جا رہی تھیں ''بھلا غضب خدا کا راتوں کو جنگلوں میں مارا مارا پھرے ہے۔ تن بدن تک کا ہوش نہیں ہے۔ ایسے باولپن کا شوق ہم نے کاہے کو دیکھا تھا؟''

اس نے نظریں جھکا کر پھر چائے پینی شروع کر دی تھی۔ اماں جی اسی طرح متوازن آواز میں جس میں غصے کے ساتھ ہمدردی کی بھی جھلک تھی اپنے جذبات کا اظہار کیے جا رہی تھیں۔

ناشتے کے بعد وہ فوراً ہی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور نادانستہ طور پر سیدھا آئینے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے چہرے کو دیکھتے دیکھتے جس پہ اسے کمزوری کی کوئی علامت نظر نہ آئی اسے اچانک اپنی اس حرکت کا احساس ہوا اور وہ فوراً آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا اس نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بستر کے سرہانے سے گھڑی اٹھائی۔ وقت واقعی کافی ہو گیا تھا۔ کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے وہ بے خیالی میں کلائی کا جائزہ لینے لگا۔ کلائی تو اتنی ہی چوڑی ہے' دبلا وہ کہاں سے ہو گیا مگر اسے پھر فوراً ہی خیال آیا کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے۔ ایک ہلکے مدافعتی جھٹکے سے اس نے اس خیال کو دفع کر دیا۔

سامنے میز پہ سے اس نے وہ ناول اٹھا لیا جسے ایک رات میں ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن جو محض شکار کی مصروفیتوں کی وجہ سے اب تک آدھا پڑھا گیا تھا۔ وہ آج اسے ختم کر لینا چاہتا تھا لیکن دو صفحے پڑھنے کے بعد اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ محض لفظ پڑھ رہا ہے اس نے پڑھے ہوئے ان دو صفحوں کو پھر کہیں کہیں سے دیکھا اور جب واقعات کا تسلسل سمجھ میں آ گیا تو آگے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے اب کے یہ احتیاط برتی تھی کہ دل ہی دل میں با آواز بلند فقروں کو پڑھتا جاتا تھا تاکہ بات ذہن نشین ہوتی چلی جائے۔ اس کی یہ احتیاط نتیجہ خیز نکلی کہانی اس کی سمجھ میں آتی چلی جا رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس میں لطف پیدا نہیں ہوا تھا وہ اب محض الفاظ کی منزل سے گزر کر محض واقعات پڑھ رہا تھا رفتہ رفتہ اس کی گرمجوشی ٹھنڈی

پڑنے لگی۔ فقروں کا باہمی ربط ٹوٹنے لگا پھر لفظ فقروں کی لڑی سے بچھڑنے لگے۔ لفظ فقروں کی لڑی سے بچھڑ کر دھندلے پڑنے لگے' گھلنے لگے' رات کا واقعہ اسے پھر یاد آ رہا تھا......

کالے درختوں اور اندھیرے کھیتوں سے ہٹ کر جلتا ہوا ایک الاؤ' روں روں کرتا رہٹ جس کی آواز ایک ہی تسلسل کے ساتھ آئے چلی جا رہی تھی اور ایک غنودگی کی فضا پیدا کر رہی تھی اور الاؤ میں آہستہ آہستہ چٹختی ہوئی لکڑیاں جس کی آگ کبھی اتنی دھیمی پڑ جاتی کہ صمد اور مولا کنجڑے کے چہرے تک اس کی نظر میں دھندلا جاتے اور کبھی اتنی تیز ہو جاتی کہ ان کے چہرے سرخ سرخ لگنے لگتے اور خود اس کے چہرے کو آگ کی لپیٹیں چھوتی محسوس ہوتیں۔

صمد کہہ رہا تھا ''میاں میری جو پیڑ پہ نظر پڑی تو دل دھک سے رہ گیا فوراً ذہن میں یہ بات آئی کہ پیچھے سے جا کے بندوق پکڑ لوں مگر میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا پاؤں سو سو من کے ہو گئے''

وہ بے پرواہی سے ہنس دیا۔

مولا کنجڑا سوچتے ہوئے بولا ''نہیں میاں میں نہ مانوں۔ ان دنوں تو دن رات یہیں رہوں ہوں مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہ پڑا''

صمد شش و پنج میں پڑ گیا ''اچھا تو بھئی میری ہی آنکھوں کا دھوکہ ہوا ہو گا اس وقت اندھیرا تو ضرور ہو چلا تھا مگر مجھے......''

''نہیں صمد میاں تمہیں وہم ہوا ہے'' مولا کی آواز میں اس وقت بڑی سنجیدگی تھی۔ پھر وہ اس کی طرف مخاطب ہوا ''نہیں میاں فکر مت کرو صمد میاں کو وہم ہوا ہے اور جب وہ آوے ہے تو ایک دن تھوڑا ہی آوے ہے وہ تو پھر روز آوے ہے''

مولا کے جواب میں پھر اسی بے پرواہی سے ہنسا ''مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا نشانہ خطا ہو گیا اور تم لوگ نہ جانے کہاں کی ہانک رہے ہو''

صمد بہت سنجیدہ ہو کر بولا ''کہاں کہاں کی ہانکنے کی بات نہیں ہے کمبخت بہت منحوس جانور ہے یہ۔ کیوں بھئی مولا؟''

''اس کی منحوسیت پن کی تو یہ سن لو کہ'' مولا اسی سوچ بھرے لہجے میں بولا ''جس بستی

میں جا کے بول دیا واں پہ سب اُجڑ گیا۔" مولا چپ ہو گیا اس نے لکڑی سے الاؤ کو کریدا اور تھوڑی سی چھپٹیاں اس میں جھونک دیں چھپٹیاں چٹ چٹ بولنے لگیں اور اس کے ساتھ آگ بھڑک اٹھی مولا اور صمد کے چہرے ننھے شعلوں کی سرخی سے پھر دمک اٹھے۔ صمد کے چہرے پہ ایک ہراس آمیز حیرت کی کیفیت طاری تھی۔ مولا بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ پھر آپ ہی کہنے لگا "اس کی تو صورت ہی منحوس ہووے ہے ایک دفعہ کیا ہوا جی۔" اس نے پھریری لی اور اس کا لہجہ اچانک تیز ہو گیا "پچھلے برس کی بات ہے' یہی دن تھے' میں گاؤں جا رہا تھا' ہو گئی رات۔ ڈول ڈول جا رہا تھا ایکا ایکی سامنے ایک ببول پہ کیا دیکھوں ہوں کہ یہ بڑا' مرغی کے برابر...... بس جی میں تو دہشت کھا گیا زمین نے پیر پکڑ لیے اور لاٹھی اٹھاؤں تو اٹھے نہیں......"

مولا چپ ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اس کی نظریں الاؤ پر جم گئیں صمد مولا کو تک رہا تھا۔ تکتا رہا' تکتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا "مگر سنیں ہیں کہ اس پہ تو وار پڑتا ہی نہیں۔"

"کوئی چیز اس کے مار وہ اسے چونچ میں داب کے اڑ جاوے گا اور ندی میں جا کے ڈال دیوے گا وہ چیز گھلتی جاوے گی اور آدمی بھی گھلتا چلا جاوے گا......" مولا چپ ہو کر پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا مگر چند ہی لمحوں بعد پھر اچانک اٹھا "صمد میاں تم نے علی کو تو دیکھا تھا نا؟"

ایک کھچی جیسا سوکھا سا شخص اس کی نظروں کے سامنے آ گیا مگر وہ چپ بیٹھا رہا صمد آہستہ سے ڈری سی آواز میں بولا "ہاں کیوں نہیں۔ دیکھا تھا۔"

"مگر میاں تم نے اسے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ تمہیں تو ان دنوں ہوش بھی نہیں تھا۔ بڑا تگڑا تھا۔ لمبا تڑنگا' یہ چوڑی چھاتی......" مولا کا لہجہ دھیما پڑ گیا "اجی ہوا کیا کہ روز رات کو...... کوئی بچہ روتا تو رونے کی نقلیں کرنے لگتا۔ کوئی ہنستا تو ہنسنے کی نقل کرتا۔ کئی دن ہو گئے تو علی نے کیا کیا کہ آنگن میں ایک کنکری پڑی تھی۔ اٹھا کے اس پہ ماری اور ہشت کر دی...... بس جی وہ اڑ گیا اور پھر نہیں آیا۔"

"ہاں پھر نہیں آیا" مولا کی آواز اور دھیمی ہو گئی اتنی دھیمی جیسے وہ کان میں باتیں کر رہا ہو "پھر نہیں آیا وہ...... اور علی' علی گھتا چلتا گیا...... جیسے کنکری پانی میں پڑی گھل رہی ہو۔ آخر

میں بالکل ہڈیوں کی مالا رہ گیا تھا......"

مولا چپ ہو گیا اور اس کی آنکھیں پھر الاؤ کی مندی پڑتی ہوئی آگ کو تکنے لگیں لپکتے لہراتے ننھے ننھے شعلے معدوم ہو چکے تھے' اندھیرے میں گھل گئے تھے اور مولا اور صمد کے چہرے پھر اندھیرے میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

"میاں مگر میں ایک بات کہوں گا۔" مولا کی بھید بھری سوچ میں ڈوبی آواز آہستہ سے پھر ابھری۔ "جب دونوں وقت مل رہے ہوں تو آپ کو بندوق نہیں چلانی چاہیے...... اس وقت پیڑ آرام کرتے ہیں"

مولا نے چھپٹیوں کی ایک بکٹ بھر کے الاؤ میں جھونکی اور الاؤ کو کریدتے ہوئے پھر بڑبڑایا۔ "پیڑ اس وقت آرام کرتے ہیں ان کی نیند میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے"

"مولا...... لا...... ہو" اندھیرے کھیتوں میں دور سے ایک آواز بلند ہوئی۔ "پانی کاٹ دے"

مولا نے زور سے آواز لگائی "او ہوت" اور اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔

چھپٹیاں ایک ساتھ زور زور سے چٹخنے لگی تھیں اور چنگاریاں اچٹ اچٹ کر اندھیرے میں بکھر رہی تھیں ایک چنگاری اس کے گال پر آ کر لگی گال پھنک اٹھا اور ہاتھ ایک ساتھ منہ کی طرف اٹھا......

خیال کی رو کھٹ سے ٹوٹ گئی وہ ہڑبڑا اٹھا۔ گری ہوئی کتاب اٹھا کر اس نے جلدی جلدی صفحے الٹنے پلٹنے شروع کیے وہ اس صفحے کو ٹٹول رہا تھا جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔

کئی بار کوشش کے باوجود جب وہ کتاب پر توجہ نہ دے سکا تو اسے خیال آیا کہ وہ رات دیر سے لیٹا تھا اور دیر سے آنکھ کھلنے کے باوجود اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ کتاب میز پر رکھ کر وہ آہستہ سے اپنے نرم گرم بستر میں گھس گیا نیند اسے نہیں آ رہی تھی پھر بھی نرم لحاف کے اندر اس کے اعضا کو ایک آسودگی سی محسوس ہو رہی تھی خواہ مخواہ کا چکر' وہ سوچنے لگا' گولیاں کئی ضائع ہو گئیں اور گرا کچھ بھی نہیں عجب منحوس دن تھا "منحوس" عجب کڈھب لفظ ہے' بے رنگ ٹیڑھی میڑھی سی شکل' مکڑی کا جالا یا سوکھا سوکھا آڑی ترچھی لنڈ منڈ ٹہنیوں والا درخت اور اس

کی نگاہوں کے سامنے واقعی اس شکل کے درخت کی تصویر بننے لگی شام کا جھٹپٹا' سوکھا سوکھا سا ایک درخت' ننگی ہوتی ہوئی شاخیں' اوپر کی شاخ پہ ایک پرند جیسے مٹی کا بڑا سا ڈھیلا رکھا ہو آخر خالی ہاتھ تو گھر نہیں لوٹنا ہے۔ اس نے بندوق کی نالی بلند کی اور اندھا دھند فائر کر دیا اور شام کے سناٹے میں گولی کی تڑاتے دار آواز گونجتی گرجتی...... خیال کی لہر تیزی سے پیچ کھاتا ہوا بھنور بن کر ایک دم سے بکھر گئی۔

اسے خفقان ہونے لگا۔ بستر سے نکل کر وہ کھڑا ہو گیا بڑی بے دلی سے اس نے سگریٹ سلگائی۔ دیا سلائی کی تیلی کا ننھا سا شعلہ دم بھر کو لہرایا اور ہوا میں گھل گیا اس نے تیلی زمین پر پھینک دی اور انگلیوں میں سگریٹ کے ساتھ اس انداز سے کرسی پہ دراز ہوا کہ اس کی آنکھیں کڑیوں کی طرف بلند ہو گئیں۔ اس نے مسلسل کئی لمبے لمبے کش لیے اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ننھا سا سرمئی بادل تیرنے لگا یہ بادل آہستہ آہستہ پھیلتا گیا' گھلتا گیا' معدوم ہوتا گیا۔ ایک باریک سرمئی لکیر ادھ جلی سگریٹ سے بلند ہو کر فضا میں حل ہو رہی تھی اسے پھر ایک بے کلی سی ہونے لگی۔ سگریٹ بجھا دی۔ خیال آیا کہ بندوق لے کر شکار کو نکل چلے۔ شغل ہاتھ آئے گا' طبیعت ذرا بہلے گی۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے' آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں کو سنوارا۔ اسے یوں لگا کہ آئینے کی سیال روشنی میں اس کا چہرہ بہہ نکلا ہے' گھلا جا رہا ہے' گویا وہ ایک کنکری...... وہ جلدی سے آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اور گلے میں خاکی تھیلا ڈال' کاندھے پہ بندوق رکھ کر تیزی سے چلا جس وقت وہ باہر کے دروازے سے نکلنے کو تھا کہ اماں جی چونکیں اور چلائیں ''ارے لڑکے تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے اتنی رات گئے آیا تھا اور اب پھر......'' اور اس نے بات کاٹتے ہوئے جلدی سے جواب دیا ''اماں جی ابھی آیا' ذرا دو کبوتر گرا لاؤں'' اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔

لہریں لیتی دھوپ میں غرق مولی' شلجم کے ہرے بھرے کھیت' سفیدی مائل سبز پتے اور ان میں سے جھانکتے ہوئے سفید گوبھی کے پھول۔ بھدے ہرے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتوں سے ڈھکے ہوئے آلو کے کھیت۔ وہ کھیتوں کے بیچ بیٹا پہ گزرتا چلا گیا لیکن ایک اُجڑے ہوئے کھیت کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ کبوتروں کی ایک ٹکڑی کھیت میں اتری ہوئی تھی اور بڑے

انہماک سے کھیت کی پولی زمین میں نہ جانے کیا چگ رہی تھی اس نے بندوق درست کی اور نال زمین کی طرف جھکا کر نشانہ باندھا' لیکن وہ نشانہ باندھتا ہی رہ گیا اور کبوتروں کی ٹکڑی بھرا کھا کے اڑ گئی۔ پروں کی ایک ساتھ بلند ہونے والی پھڑ پھڑاہٹ اس کے ذہن میں گونجتی چلی گئی جیسے کسی نے اچانک بہت سی کنکریاں چھاج سے پھٹک کے پھینک دی ہوں، سرمئی کنکریاں' فضا میں تیرتی ہوئی دور ہوتی ہوئی ٹکڑی' سرمئی کنکریوں کا بہتا ہوا گھلتا ہوا دل' وہ آگے بڑھ لیا۔

چلتے چلتے اس کے کان کھڑے ہوئے کوہو کوہو کی مدھم آواز جیسے پانی کے کٹورے میں کوئی آہستہ آہستہ گھوکھرو گرا رہا ہو۔ اس کی نگاہوں نے آس پاس کے درختوں کا' ان کی ڈھکی چھپی اور کھلی ڈلی شاخوں کا جائزہ لے ڈالا۔ پاس کے ایک درخت پہ ایک کوا بیٹھا تھا جس نے اس کی نگاہ کو تاڑا اور کائیں کائیں کرتا اڑ گیا ٹیلی گراف کے دودھیا تار پہ نہ جانے کب سے ایک دھوبن چڑیا بیٹھی تھی جس نے اچانک چونک کر اپنی دم کو ایک دو مرتبہ جنبش دی اور پھر اڑ گئی۔ اجلی چمکتی دھوپ میں اسے دور تک ایک چونا جیسی چیز تیرتی نظر آتی رہی۔ چونے کی ڈلی آہستہ آہستہ مدھم پڑتی گئی' فضا میں حل ہوتی گئی۔ اس کی نگاہ اوپر سے اچٹ کر جب سامنے والے اونچے شیشم پر پڑی تو اونچی پھننگ پر ایک فاختہ بیٹھی نظر آئی' لگتا تو نہیں تھا کہ بول رہی ہے مگر پانی کے کٹورے میں آہستہ آہستہ گوکھرو گرنے کی صدا بدستور آ رہی تھی اس نے بندوق کی کالی نال کو فضا میں بلند کیا اور شست باندھی۔ ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے جب اس نے کالی نال کی سیدھ میں فاختہ کو دیکھا تو اسے فاختہ کی جگہ ایک بدرنگ بے شکل گول مول سی شے نظر آئی۔ پانی کے کٹورے کی تہہ میں بیٹھا ہوا ایک گوکھرو' ایک کنکری۔ وہ کئی لمحے شست باندھے رہا بندوق کے گھوڑے پہ اس کی گرفت سخت ہوئی مگر پھر ڈھیلی پڑ گئی اور نال نیچے جھک گئی۔ شیشم کے پیڑ سے آگے نکل جانے پر بھی اسے دیر تک پانی کے کٹورے میں گوکھروؤں کے ڈھلکنے کی آواز آتی رہی۔

کئی مرتبہ اس نے اپنی بندوق کی نال کو فضا میں بلند کیا اور کئی مرتبہ ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے اور ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں پہ شست باندھی لیکن ہر مرتبہ نشانہ بندھ جانے کے

باوجود اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا اور نال نیچے جھک گئی۔ اس کی طبیعت اب گری گری تھی اور ایک ان جانی' ان بوجھی اداسی اس کے دل و دماغ میں تیرتی چلی جا رہی تھی کاندھے پہ رکھی ہوئی کالی بندوق اور گلے میں پڑا ہوا خاکی تھیلا اسے اپنے اوپر ایک بوجھ لگنے لگا۔ اسے ہر چیز سے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ بندوق سے' شکار کے تھیلے سے' بندوق کو نشانے کیلئے بلند کرنے سے اور خود شکار کے جانوروں سے۔ ایک بھورا تیتر اس کے بالکل قریب سے بھورے بھورے ڈھیلوں کے درمیان سے اٹھا اور اس کے سر سے گزرتا چلا گیا اس نے بڑی سرد مہری سے تیتر کو اس بھوری مٹی کے ڈھیلے کو ہوا میں حرکت کرتے دیکھا اور اپنے آپ میں کوئی رد عمل محسوس کیے بغیر اسی انداز سے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ وہ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت جو کچھ دیر پہلے جاڑے کی سیال چمکتی دھوپ میں لہریں سی لے رہے تھے' اب آہستہ آہستہ آس پاس پھیلتی چھاؤں میں چھپتے جا رہے تھے۔ قریب ہی گھاس کے ایک تختے پہ اب تک دھوپ چمک رہی تھی اگرچہ اس کی چمک دمک ماند پڑ چکی تھی۔ بے ارادہ' بے نیت وہ اس گھاس کے تختے کی طرف ہولیا۔ بندوق ایک طرف ڈال' تھیلے کو سرہانے رکھ وہ آہستہ سے لیٹ گیا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ وسیع و عریض آسمان اس پہ جھکا آ رہا تھا۔ وسیع و عریض آسمان' بیکراں فضا میں بلند ہوتے ہوئے اونچی چوٹیوں والے درخت' مغرب کی سمت میں بھڑکتا ہوا اور چکا چوند پیدا کرتا ہوا روشنی کا ایک حلقہ اور وہ' گھاس کے تختے پہ بڑا ہوا ایک دبلا پتلا جسم' ایک مٹی کا ڈھیلا' امنڈتے ہوئے سمندر میں ایک بہتا پتہ' ایک گھلتی کنکری۔ اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ فطرت کی دشمن فوجیں اب بھی پسپا نہ ہوئیں اب سماعت کے رستے یورش ہو رہی تھی۔ طوطے اور ڈومنیاں اور گلگلیں اور نہ جانے کون کون سے پرندے اتنا شور مچا رہے تھے گویا وہ آپس میں گتھ گئے ہیں اور گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ان چمکتی ہوئی مہین آوازوں میں کوؤں کی پھٹے بانسوں کی سی آوازیں بھی خلط ملط ہو رہی تھیں۔ نرم اور مہین اور کرخت اور بلند آوازوں کا ایک بھنور۔ آوازوں کی چڑھتی چمکتی ندی۔ اور وہ' ایک نحیف تھکی ہوئی آواز' چڑھی ندی کے ریلے میں بہتا پتہ' ایک گھلتی کنکری۔ ندی چڑھتی گئی اور پورے زور پہ آ کے پھر ڈھلنے لگی۔ شور دھیما پڑ گیا اور

ایک گلگل کی نرم رو خوشگوار آواز الگ سنائی دینے لگی تھی۔ اس ماند ہوتے ہوئے شور سے الگ بہت بلندی سے قائیں قائیں کا ایک دھیما شور آتا سنائی دیا۔ تھکی ہوئی کراہتی آواروں کی ایک ٹمٹماتی لکیر۔ قازیں...... ایک قطار میں اڑتی چلی جا رہی تھیں اسے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ یہ واقعی قازیں نہیں ہیں بلکہ کسی نے پنسل سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر قازوں کی شکلیں بنا دی ہیں اور قازوں کی شکل کے یہ ہلکے سرمئی نقش' سرمئی نقشوں کی یہ دھندلی لکیر آسمان کے بھدے آسمانی رنگ میں گھل جائے گی' معدوم ہو جائے گی...... سرمئی دھاری کو بھدے آسمانی رنگ میں گھلتے ملتے دیکھتا رہا پھر اسے خفقان ہوا اور وہ تھیلا گلے میں ڈال بندوق کاندھے پہ رکھ اٹھ کھڑا ہوا۔

چلتے ہوئے رہٹ کے قریب پہنچ کر وہ بے دھیانی میں پانی کی کنڈی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ چلتے ہوئے پانی میں اسے اپنا چہرہ یوں دکھائی دیا کہ وہ گھل رہا ہے' لمبا ہوتا جا رہا ہے جیسے علی...... اسے ایک ساتھ ہوش آیا اور ایک جھرجھری سی لے کر وہ آگے چل پڑا۔

ادھر ادھر پھیلے ہوئے کھیتوں کے درمیان بیٹا پہ چلتے چلتے کبھی کبھی اس کا قدم بہکتا اور نالی میں جا پڑتا۔ جس میں پانی دھیمی رفتار کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ دھیمی رفتار سے بہتا ہوا پانی' ایک منور لکیر' گلگل کی نرم رو خوش گوار آواز۔ اس نے پانی سے توجہ ہٹا کر ارد گرد کے کھیتوں پر نظر ڈالی۔ دن چھپ چلا تھا اور اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے ہرے پتوں پر سفید سفید دھواں منڈلا رہا تھا۔ بھدا نیلا آسماں' چپ چاپ اونچے پیڑ' سوتے ہوئے کھیت' سب کے سب گھلے جا رہے تھے۔ سفید سفید دھواں سا بنتے جا رہے تھے اور وہ سفید سفید دھواں خود شام کی گہری ہوتی ہوئی کالونس میں گھل رہا تھا۔ اس کی نگاہ اچٹ کر سامنے والے پیپل پہ جا پڑی۔ وہی کل والا پیپل جو لنڈ منڈ نہیں تھا۔ مگر ٹیڑھے میڑھے بل کھاتے ہوئے گدوں پر پتے کچھ اس قدر مختصر تھے کہ لنڈ منڈ سا لگتا تھا۔ اس نے نادانستہ طور پر اس کے ہر گدے کا جائزہ لیا جائزہ لینے کے بعد پھر جائزہ لیا ایک شاخ پر خواہ مخواہ اس کی نگاہیں ٹھٹھک گئیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی بندوق بلند ہوئی اور کالی نال کا رخ شاخ کی طرف ہو گیا۔

''میاں جی دونوں وقت مل رہے ہیں' بندوق مت چلاؤ''

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ گوبھی کے کھیت میں گیلی مٹی میں سنا ہوا کسلا اٹھائے مولا کھڑا تھا۔ بندوق کی نالی جھک گئی اس روز وہ کاندھے پہ بھری بندوق رکھے گھر لوٹا۔

صبح کو جب وہ منہ دھونے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا تو اچانک وہ آئینہ رہٹ کے برابر والی پانی کی کنڈی بن گیا اور اس کا چہرہ گھلتا گیا لمبا ہوتا گیا۔ جیسے علی...... اسے ایک ساتھ ہوش آیا اور وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

مولا بتاتا ہے کہ اگلے روز بھی دن چھپے وہ پیپل کی طرف بندوق تانے کھڑا دکھائی دیا تھا مگر پھر خود بخود بندوق کی نال نیچے جھک گئی اور وہ پھر بھری بندوق کاندھے پہ رکھے گھر کو واپس ہولیا تھا۔